

لالہ زار
خواجہ عبدالغفور

لالہ زار

خواجہ عبدالغفور

بار اوّل

تعداد اشاعت ۱۰۰۰
سرورق .... کے، ایچ، آرا
پرنٹر ...... شہریار عابدی
پبلشر ...... محمد قربان لاری والا
مطبع ...... رپورٹر آفسیٹ پریس
۹۷، مورلینڈ روڈ بمبئی ۸
کتابت ...... قاضی مشیر، محمد علی
قیمت ...... ۵ روپے

فہرست

انتساب

والد محترم خواجہ نصیر الدین صاحب
کے نام کہ جن کی تربیت تعلیم اور ضبط و تنظیم
کی بدولت مجھے وہ سب کچھ ملا کہ جس کی میں آرزو
اور تمنّا کر سکتا تھا۔

علی سردار جعفری

دیباچہ

خواجہ عبدالغفور صاحب کے دلکش مضامین کا مجموعہ میرے دیباچے کے ساتھ ناظرین کرام کی خدمت میں آرہا ہے۔ میرے دیباچے کی حیثیت دامان باغبان وکف گلفروش سے زیادہ نہیں ہے۔ اصل رنگ و بُو حسن و لطافت تو ان پھولوں کی خوبی ہے جو بازار میں آتے ہیں۔ سبدِ گل تو محض ایک بانس یا بید کی ٹوکری ہے جس کی وقعت پھولوں نے بڑھادی ہے۔

دراصل غفور صاحب کے مضامین کو میرے دیباچے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ پھول شاخِ گل سے صاحبانِ ذوق کے دست و گریبان اور طرّۂ دستار تک براہ راست پہنچ سکتے ہیں۔ کسی باغبان و گل فروش کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن حسن کی داد دینا اور صداقت کی گواہی دینا بجائے خود ایک مبارک فعل ہے۔ یہی میرے دیباچے کا جواز ہے۔

غفور صاحب سے میری ملاقات بمبئی میں چند سال پہلے اس طرح ہوئی تھی کہ ایک مشاعرہ ہونے والا تھا اور ہمارے ایک شاعر دوست کی "خودی" کچھ اس طرح ضرورت سے زیادہ "بلند" ہوگئی تھی کہ خدا بھی یہ پوچھنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا کہ "بتا تیری رضا" کیا ہے اور غفور صاحب مشاعرے کے منتظم تھے اور میرے پاس بغیر کسی تعارف اور بغیر کسی تکلف کے مشورہ کرنے چلے آئے تھے۔ ان کے لب و لہجہ اور انداز نشست و برخاست سے میں نے فوراً پہچان لیا

کہ یہ سراپا حیدرآباد کی تہذیب کا ڈھلا ہوا ہے اور بے شمار حیدرآبادی دوستوں کی تصویریں نظروں میں پھر گئیں۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ آپ ایک حیدرآبادی سے دوستی کر لیجئے اور پھر چراغ سے چراغ جلتا چلا جائے گا اور ہر حیدرآبادی آپ کو اپنا دوست نظر آئے گا تھوڑی سی گفتگو کے بعد یہ پتہ چل گیا کہ غفور صاحب میرے بہت سے دوستوں کے دوست ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم چاک گریبانوں سے اتنے قریب ہونے کے بعد وہ ابھی تک اپنے گریبان کو صحیح و سلامت رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ یعنی آپ حکومت کے ایک اعلیٰ افسر بھی ہیں۔

وہ جسے انگریزی میں بیوروکریسی اور آج کل کے اُردو ترجمے میں نوکر شاہی کہتے ہیں اس کے لئے ہمارا ایک قدیم لفظ اہل کار ہے جو انگریزی اقتدار کے زمانے میں کلرک کے معنوں میں محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ زمانۂ قدیم میں اہلکار واعظ، ملاّ اور زاہد ہوتے تھے جو قاضی اور محتسب کے عہدے پر فائز کئے جاتے تھے اور ہمارے قدیم شعرا کی رائے ان کے متعلق کچھ اچھی نہیں تھی۔ حافظ شیرازی کی شگفتہ بیانی نے صرف ان کے خلوت میں جاکر "کار دیگر" کرنے کی مذمت کی ہے لیکن شیخ سعدی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ "معذوری کے وقت یہ اہلکار شبلی اور بایزید کی طرح پاکباز بن جاتے ہیں لیکن جب پھر برسر اقتدار آتے ہیں تو شمر ذوی الجوشن اور یزید کی طرح ظالم اور سفاک ثابت ہوتے ہیں" ؎

اہلکاران بوقتِ معذوری   ہمہ شبلی و بایزید شوند
چوں بیایند باز برسرِ کار   شمر ذوی الجوشن و یزید شوند

حالانکہ آج کل کے اہلکار زیادہ پڑھے لکھے، زیادہ مہذب اور زیادہ وسیع القلب ہوتے ہیں،

پھر بھی رائے عامہ ان کے حق میں کچھ بہت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ عام طور سے ان کو رعونت کا شکار سمجھا جاتا ہے اور سرخ فیتے کی کارستانیوں میں ان کی مہارت کا جواب ہی نہیں ہے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ آج کے عہد میں ایسے اہلکار کا وجود ممکن ہے جو برسر اقتدار رہتے ہوئے بھی اپنی طبیعت میں شبلی اور بایزید کا سا سوز و گداز رکھتا ہے اور دل میں عام انسانوں کے لئے درد کی کسک محسوس کرتا ہے۔

غفور صاحب بظاہر مجموعۂ اضداد معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل یہ ان کی پہلودار شخصیت کا کرشمہ ہے کہ وہ بیک وقت اچھے سرکاری افسر اور اس سے بھی اچھے دانشور ہیں اور وصف یہ ہے کہ اس دانشوری میں خشونت نہیں ہے۔ وہ رند خشک اور زاہد تر ہیں۔ خشک رہ کر رندی کو باقی رکھنا بڑی بات ہے اور زہد کے بعد بھی تر دامنی کے احساس کو زندہ رکھنا اور بھی بڑی بات ہے۔ عمرانیات اور سماجی علوم کے ماہر ہونے کے بعد بھی ان میں وہ شئے لطیف کم نہیں ہے جو دل کو طنز و مزاح کی طرف مائل کرتی ہے اور شعر و شاعری سے لطف اندوز ہونے پر اکساتی ہے۔ روزہ نماز اور مذہب کی ساری رسومات کی پابندی کے باوجود وہ رقص و موسیقی سے پرہیز نہیں کرتے بلکہ موسیقی میں تو انہوں نے ذوق دل کے ساتھ علمی بصیرت بھی حاصل کر لی ہے۔ وہ دوسروں کو ہنساتے ہیں اور اپنے اوپر ہنس لیتے ہیں لیکن دوسروں پر ہنسنے سے پرہیز کرتے ہیں اور یہ تہذیب و شرافت کی دلیل ہے۔ ان کے اندر وہی کیفیت ہے جس کو کسی فارسی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے کہ "اس کے ایک ہاتھ میں شریعت کا جام ہے اور دوسرے میں لوہے کی نہائی جس سے ٹکرا کر جام پاش پاش ہو سکتا ہے۔ ہر ہوسناک آدمی کو جام اور نہائی سے کھیلنے کا حق نہیں ہوتا۔"

در کفے جام شریعت در کفے سندانِ عشق

ہر ہوسناکے ندانند جام و سندان باختن

یہ جو انگریزی سے اُردو تک غفور صاحب کے مضامین اور تصانیف میں تنوع پایا جاتا ہے اور رنگارنگ کیفیت نمایاں ہے یہ ان کی پہلو دار شخصیت کے مختلف جلوے ہیں چنانچہ قہقہہ زار اور شگوفہ زار کا مصنف زیارتِ دیارِ حبیب پر بھی لکھتا ہے اور زائرین حرم کی خدمت میں الفاظ کے ذریعے سے کعبۃ اللہ کو بھی پیش کرتا ہے۔ اس کا قلم مہاتما گاندھی کی خوش مذاقی اور مخدوم کی لطیفہ گوئی کا احاطہ کرتا ہے، پھر بمبئی کی بارش پر چھینٹے اڑاتا ہے۔ وہ شاعری کر کے بہت "بیزار" ہونے کی منزل میں بھی قدم رکھتا ہے اور جان نثار اختر کی رُباعیوں پر تبصرہ بھی کرتا ہے۔ جب آپ یہ مضامین پڑھیں گے تو ان کے ظاہری مزاحیہ لباس کے اندر سے ایک نہایت سنجیدہ شخصیت جھانکتی ہوئی نظر آئے گی لیکن جب آپ اس کو آداب عرض غفور صاحب کہہ کر مخاطب کرنا چاہیں گے تو وہ پھر مزاح کے پردوں میں جا چھپے گی اور آپ کا شوقِ ملاقات اور بڑھ جائے گا۔

اور غفور صاحب سے ملاقات کے بہت سے مقامات ہیں۔ بمبئی کی ہر ادبی اور تہذیبی محفل میں وہ نظر آئیں گے۔ لیکن خاص طور سے سُر سنگار سمسد اور اُردو سرکل میں نمایاں ہونگے۔ وہ اپنے دفتر میں سرکاری کام کرتے نظر آئیں گے اور گھر کے اندر احباب کے حلقے میں ہنستے بولتے۔ اور انہیں لمحوں میں وہ کوئی نہایت سنجیدہ تجویز لے کر سامنے آجائیں گے۔ جیسے کسی لغت کی تیاری یا اُردو، ہندی، مراٹھی، گجراتی کی بہترین نظموں پر انعام۔ پھر مزے کی بات یہ ہے کہ مشورے کے ساتھ ساتھ وہ سارا سامان بھی موجود ہوگا جس سے یہ تجویز عملی جامہ پہن سکے۔

اور اس طرح انہوں نے بمبئی کے ادبی اور تہذیبی حلقوں میں اپنے لئے ایک مخصوص مقام بنا لیا ہے۔ آج بمبئی کی زندگی غفور صاحب کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اس کتاب کے پڑھنے والے اس کے مضامین کے ذریعے سے غفور صاحب کی ایک جھلک دیکھ سکیں گے اور پھر ملنے کے لئے مشتاق نظر آئیں گے۔ اور اگر ملاقات ہوگئی وہ نہایت نفیس چائے پلائیں گے اور نہایت اچھا کھانا کھلائیں گے۔ اور بیگم غفور زیادہ سے زیادہ کھلانے پر اصرار کریں گی۔

میں غفور صاحب کی نئی کتاب کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس میں تجدید ملاقات کا وصف ہے۔

سردار جعفری

بمبئی۔ جون ۱۹۷۳ء

★ شہر یار عابدی

عرضِ ناشر

اردو صحافت اور نشر و اشاعت کا طویل تجربہ رکھتے ہوئے بھی جب خواجہ عبدالغفور صاحب کی تصنیف "قہقہہ زار" کو شائع کرنے کی ذمہ داریاں میں نے سنبھال لیں تب مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایک "پبلشر" کہلانے سے قبل کیسی کیسی اور کتنی طرح کی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔۔۔ کتابت اور تصحیح کے مرحلوں سے لے کر مطبع میں مشینوں کی نازک مزاجی اور ان پر کام کرنے والے کارکنوں کی تلون مزاجی تک کتنے ہی مرحلے ایسے آئے کہ بار بار ہمت جواب دے جاتی تھی اور دل یہ کہتا تھا کہ اس بار یہ کام ہو چکے تو آئندہ کے لئے کان پکڑ لیا جائے۔۔۔ لیکن جب کتاب تیار ہو چکی اور اہل قلم اور اہل نظر نے اپنے تبصروں سے اسے نوازا اور رسائل و جرائد میں اس پر اچھے ریویو ہوئے تب اندازہ ہوا کہ خواجہ عبدالغفور صاحب کی تصنیف نے داد و تحسین کا جو خراج بے پایاں قدردانوں سے حاصل کیا ہے اس کی کچھ "تلچھٹ" اپنے حصے میں بھی آئی ہے۔ اسی کا سرور کہہ لیجئے کہ جب خواجہ صاحب کے پاس مضامین کا ایک اور اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا تو میں پھر ان کے سر ہو گیا کہ اب اس مجموعے کو بھی چھپنا چاہیئے اور یہ کہ اس بار بھی یہ کام میں ہی انجام دوں گا۔!

قہقہہ زار نے اگر مقبولیتِ عوام پائی تو "شگوفہ زار" نے مقبولیتِ خواص حاصل کی۔۔۔ قہقہہ زار سے لطف اندوز ہونے والوں میں اردو کے علاوہ ہندی، مراٹھی اور سندھی کے پڑھنے

والے بھی شامل تھے۔ "شگوفہ زار" کو نسبتاً اُردو ادب سے قریبی تعلق رکھنے والوں نے پسند کیا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ قہقہہ زار میں خواجہ صاحب نے جس موضوع کو سرسری طور پر چھُوا تھا "شگوفہ زار" میں انہوں نے نسبتاً گہرائی سے اسی موضوع کو برتا ہے۔ "قہقہہ زار" طنز و مزاح اور لطائف کا ایک باسلیقہ مجموعہ تھا لیکن شگوفہ زار اسی موضوع کی ایک مکمل بائیبلوگرافی تھی۔

مجھ سے ایک اردو ادیب نے جو ہندوستان گیر شہرت رکھتے ہیں، کہا کہ مزاح اور فقرے بازی اور ضلع جگت کو ہم بھی جانتے ہیں اور اسے استعمال بھی کرتے رہے ہیں لیکن خواجہ صاحب نے جس خوبی سے مزاح کی ان اصناف کو علاحدہ خانوں میں بانٹا ہے اور ان کا تقابلی مطالعہ کیا ہے وہ ایک انوکھی چیز ہے اور اُردو ادب کی تاریخ میں اس طرح کا کام بالکل نہیں ہوا۔

"قہقہہ زار" طنز و مزاح کی ایک ہلکی پھلکی کاوش تھی تو "شگوفہ زار" اُردو لٹریچر کے کسی بھی طالب علم کے لئے ایک قیمتی سوغات۔ یہ دونوں کتابیں اگرچہ ایک دوسرے سے مربوط نہیں ہیں تاہم خواجہ صاحب کا شگفتہ اور بے ساختہ اندازِ تحریر ان کو ایک دوسرے کا تسلسل بنا دیتا ہے۔

یہ میرا منصب نہیں ہے کہ ان دونوں کتابوں کا توصیفی جائزہ بھی لوں۔ کرشن چندر، علی سردار جعفری، سلمیٰ صدیقی، ظ انصاری، جاں نثار اختر، احمد جمال پاشا اور دوسرے متعدد اہل قلم نے جن تصانیف کو سندِ قبولیت دی ہو ان کے بارے میں میرا کچھ لکھنا نہ تو ضروری ہے، نہ معنی خیز ہوگا۔

خواجہ عبدالغفور صاحب بے حد نفاست پسند آدمی ہیں۔ لباس اور رہن سہن کی طرح وہ تقریر و تحریر میں بھی نفاست برتتے ہیں۔ اچھے کاغذ پر اور اچھے خوبصورت خط میں

مسودہ تحریر کرتے ہیں کہ ایک ایک لفظ صاف صاف پڑھا جاتا ہے۔ تحریر میں کاٹ چھانٹ تک کو روا نہیں رکھتے۔ قدرتی طور پر ان کے نزدیک کتابت و طباعت کے بھی کچھ معیار ہوں گے۔ میری شائع کردہ پہلی کتابیں ان معیاروں پر پوری نہیں اتر سکیں۔ خواجہ صاحب نے وسیع القلبی سے کام لیا اور ان کوتاہیوں کو میری مجبوری پر محمول کر کے درگذر کیا۔ لیکن اس بار "لالہ زار" میں میں نے خواجہ صاحب کی کاوش کے ساتھ پورا تعاون کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتابت پر زیادہ دھیان دیا گیا ہے اور طباعت کے لئے آفسٹ کا جدید طریقہ استعمال کیا گیا ہے جو موجودہ دَور کا سب سے کامیاب طریقۂ طباعت ہے۔ اس لئے مجھے توقع ہے کہ خواجہ صاحب کے مضامین کا یہ مجموعہ حسن معنی کے ساتھ ساتھ حسن ظاہری کی بھی خوبیوں سے مصور ہوگا اور قدردانوں کے معیارِ پسندیدگی پر پورا اترے گا۔

مخدوم کی لطیفہ گوئی

سبط حسن کی زبانی : مخدوم بزمانہ جوانی

"آبنوسی رنگ کا ایک نہایت وجیہہ نوجوان لمبے لمبے سیاہ بال چوڑی پیشانی ستواں ناک یونانی دیوتاؤں کے سے ترشے نقوش۔"

علی سردار جعفری مخدوم کے متعلق لکھتے ہیں

بڑی بڑی چمکدار آنکھیں نظروں میں عقاب کی آنکھوں کی تیزی آبنوسی چہرہ جیسے کسی نے اسے تراش دیا ہو۔ چہرے پر سنگ تراش کی چھینی کے نشانات رخساروں کی ہڈیوں کا ہلکا سا ابھار بلند پیشانی زوردار ٹھوڑی اور بھینچے ہوئے ہونٹ۔ صرف دو چیزیں مخدوم کی شخصیت میں لچک اور لطافت پیدا کرتی ہیں ایک اس کا تبسم دوسری اس کی تیز نظروں میں گھلی ہوئی محبت۔

کالج کے زمانے کا ایک نہایت ہی دلچسپ واقعہ سناؤں یہ بالکل ابتدا تھی مخدوم کی شاعری کی۔

دارالاقامہ لیاقت منزل کے ایک ساتھی کا دوشالہ چوری ہوگیا یا چرا لیا گیا پوچھ تاچھ اور تلاش کئی دن جاری رہی۔ ساتھیوں کو سوالات کا موقع ملا اور ملتا

ہی گیا۔ دوشالہ کا مصرف و استعمال اور بالخصوص اس کا پیلا رنگ خاص طور پر توجہ کو مبذول کرانے لگے۔ ان سب کے جواب میں ایک چٹخارے دار لاجواب مرصع نظم تیار ہوگئی۔ شاعر لافانی تھے مخدوم محی الدین اور عنوان تھا "پیلا دوشالہ"۔

جس دم میں سنا چل بسا وہ ناز کا پالا — وہ پیلا دوشالہ
رنگ اڑ گیا اور دل میں دھنسا یاس کا بھالا — وہ پیلا دوشالہ
وہ کون بلا وڑ تھا جو چٹ کر گیا تجھ کو — چٹ کر گیا مجھ کو
تو کون سے موئے کا بنا تازہ نوالا — وہ پیلا دوشالہ
او گرم کن پہلوئے من باز بیائی — زگریم ز جدائی
آں روز بیاد آر کہ من زیر تو بالا — وہ پیلا دوشالہ

یہ نظم اس قدر مقبول ہوئی کہ سب کے بے حد اصرار پر اس شاہکار کو پیلے کاغذ پر طبع کرا کے تقسیم بھی کر دیا گیا اور کچھ ہی دنوں میں کالج کے ہر طالب علم کی زبان پر تھی بلکہ شہر کا بچہ بچہ اس کو گلی گلی گاتا پھرتا تھا۔ پھر اس کے کورس ہوتے لگے اور کہیں کہیں بطور قوالی گائی جانے لگی۔

انہی دنوں کلیہ جامعہ عثمانیہ اڈیکمیٹ کے بے انتہا حسین، رومان پرور اور بے حد خوبصورت ماحول میں اپنے سارے دارالاقاموں کے ساتھ منتقل ہوگیا۔ حسن اتفاق کہ انہی دنوں دارالاقامہ میں بہت بڑے پیمانے پر سالانہ جشن منعقد ہوا۔ اس میں سب سے اہم اور مقبول ایٹم رکھا گیا قوالی کا۔

کھلے میدان میں بہت بڑا اسٹیج سجایا گیا اور اس پر ایک بزرگ صورت تقدس

ماب مولویانہ حُلیے کے ساتھ اپنے مریدوں معتقدین اور حواریوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے اور قوالوں کی ٹولی نے اپنے ردادیوں کے ساتھ ڈھولک پر "او پیلا دوشالہ" چھیڑ دیا۔ دھن یہی تھی۔

"گریم ز جدائی۔ گریم ز جدائی"

اور بیچ بیچ میں

"او پیلا دوشالہ، او پیلا دوشالہ"

یہ سب اس خضوع اور خشوع کے ساتھ گایا جا رہا تھا کہ حاضرین اور سامعین پر رقّت طاری ہو گئی۔ نذر و نیاز بھی پیش خدمت ہونے لگیں۔

اسٹیج پر جو صدر محفل بزرگ صورت تشریف فرما تھے، ان پر بھی حال کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ ان کے دست مبارک سے اور قدوم میمنت لزوم سے قوالوں کو روپے دیئے جانے لگے۔ داد و دہش کا سلسلہ چل پڑا۔ جوں جوں سماں بندھتا گیا پیر و مرشد کو حال کچھ زیادہ ہی چڑھنے لگا۔ اور وہ خود بھی داد و دہش کے موڈ میں بہت دور نکل گئے۔ پہلے تو اپنا رومال قوالوں کو عطا کیا پھر شملا بھی دے دیا۔ کچھ دیر بعد شیروانی نذر کر دی۔ اب اسٹیج پر اور بھری محفل میں وہ صرف کرتا اور پائجامہ زیب تن کئے خضر صورت تشریف فرما تھے اور حال چڑھتا جا رہا تھا۔ مریدوں کے گروہ سے روپے کی شکل میں نذر و نیاز بھی کم ہو گئی بلکہ بند ہو گئی۔ لیکن پیر و مرشد کی تڑپ سوا تھی۔ قوالی کے ایٹم کا کلائمکس قریب تھا۔ بالآخر انہوں نے بے ساختہ اور برجستہ طور پر اپنے موئے مبارک پر بزرگانہ انداز سے ہاتھ پھیرا اور اپنی نقلی داڑھی و مونچھ

کو کھینچ کر نکالا اور ایک خاص ادائے مرشدی سے ریش مبارک قوال کو نذر کر دی۔

کہاں تو گریم زجدائی، گریم زجدائی نے رقّت آمیز سماں کھینچ رکھا تھا اور کہاں اس حرکت نے قہقہوں اور ہنسی کا طوفان عظیم برپا کر دیا۔

اب سنیئے کہ یہ پیر و مرشد کون تھے۔

مولانا مولوی مخدوم محی الدین!

"اِس بے ساختگی پر کون نہ مرجائے اے خدا"

یہ تھا مخدوم کا مذاق، طنز مزاح بھرپور اور برجستہ۔

"صاجیب" دارالاقامہ کے مودب (وارڈن) تھے ان سے چشمک اور نوک جھونک تو دن رات کا معمول تھا اور وہ سارے لطیفے جو بعد میں زبان زدِ عام ہوئے اور مختلف حوالوں اور راویوں کے ذریعے پھیلے ان کا سرچشمہ و منبع یہی مخدوم تھے اور ان کے ساتھی ان کو ہوا دیتے اور کسوٹی پر کس کر عام محفلوں میں پہنچا دیتے۔

اڈیکمیٹ میں دارالاقامہ کی نئی عمارتیں تعمیر ہو چکی تھیں۔ صاجیب کا دفتر اونچی ٹیکڑی پر تعمیر شدہ بی ہاسٹل کی شاندار عمارت کی اوپری منزل میں تھا۔ شام کا وقت تھا۔ مخدوم بھی کسی کام سے صاجیب کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ کام کی باتیں ختم ہوئیں اور وہ اٹھنے لگے تو صاجیب کی نظر دریچے سے باہر آسمان پر ڈوبتے سورج کی روپہلی اور سنہری کرنوں پر پڑی اور انھوں نے سب سے اور بالخصوص مخدوم

سے کہا کہ ذرا ٹھہرنا ابھی جب سورج پوری طرح غروب ہو جائے گا تو افق پر غروب آفتاب ایک بڑا ہی دلکش مرقع پیش کریگا۔ حکم حاکم سمجھ کر سب ٹھہرنا ہی چاہتے تھے کہ مخدوم نے نہایت ہی معصومانہ اور برجستہ انداز میں کہا کہ صاحب ہم ذرا جلدی میں ہیں لیکن اس غروب آفتاب کے خوبصورت منظر کو دیکھنے کل صبح ضرور حاضر ہو جائیں گے۔ یہ کہا اور ہم سب کو ہکا بکا چھوڑ کر رفوچکر ہو گئے۔ بڑی دیر کے بعد صبح کے وقت غروب آفتاب کی نظارہ بازی سمجھ میں آئی اور قہقہوں کا پھر طوفان پھٹ پڑا۔

انہی دنوں ایک بار ایک چھوٹی سی بیٹھک میں شعر و شاعری کا دور چل رہا تھا کسی نے ایک دو شعر بڑے عمدہ سنائے اور کہا کہ بڑے پایے کے شعر ہیں نہ معلوم کس کے ہیں۔

مخدوم نے فی البدیہہ جڑ دیا کہ یہ ضرور کسی چار پایہ کے ہوں گے کچھ معمولی شعر تھوڑے ہیں یہ پھبتی خوب چلی اور ہر اچھا شاعر چار پایہ کا درجہ حاصل کرنے لگا۔ یہ لطیفہ اس وقت تک چلتا رہا کہ جب صاحب کی زبان سے بھی چارپائی کے لئے چارپایہ ہی نکل گیا۔ اور پھر سے دیوار قہقہہ کھڑی ہو گئی۔ اور اسی قسم کی دیواروں پر عمارتیں تعمیر ہوتی رہیں جو اس قدر مضبوط بنیادوں پر قائم ہیں کہ اداسی طبیعت اور مزاج کے تکدر کو ٹھنڈی چھاؤں سہارا اور آسرا دیتی ہیں۔

مخدوم نے جہاں صحیب کو زندۂ جاوید کیا وہیں پر حیدرآباد کی ایک اور ہستی کو شہرۂ آفاق بنا دیا۔ ہر لطیفہ ہر چٹکلہ ان پر چسپاں کیا جاتا حتیٰ کہ انہی کے نام سے

جمالستان" کی ترتیب اور تالیف شروع بھی کی گئی کہ جس کے سرورق پر ایک شخص کو بنایا گیا جو موسلادھار بارش میں برساتی پہنے چھتری لگائے باغ میں درختوں کو پانی دے رہا ہے۔ یہ کاوش تکمیل کو نہ پہنچ سکی لیکن رہبر دکن کے مزاحیہ کالم رہبر و راہرو میں ناکارہ حیدرآبادی خوبیوں کے ایک بزرگ کے نام سے مخدوم کے گھڑے ہوئے لطیفوں کو عوام الناس تک پہنچاتے تھے۔

مہاتما گاندھی اور ان کی خوش مذاقی

مہاتما گاندھی نہایت ہی سنجیدہ، خدا ترس اور مذہبی آدمی تھے۔ ان کی شخصیت اِس قدر اعلیٰ و ارفع تھی کہ لوگ از خود ان کے سامنے سر جھکایا کرتے تھے۔ حالانکہ ان کی سادگی ان کا اخلاق و کردار اور ان کا رہن سہن ایسا تھا کہ غریب سے غریب آدمی کو بھی ان میں اور خود میں کچھ فرق نہ دکھائی دے سکتا تھا۔ ہم نے ان کی اس سادگی میں بھی وہ دبدبہ اور شان دیکھی ہے کہ جو بڑے سے بڑے فرمانروا اور حاکمِ وقت کے دربار میں بھی نہیں مل سکتی۔ اپنی سروس کے ابتدائی دَور میں چونکہ وردھا پر اکثر ٹھہرنے کا اتفاق ہوا کرتا تھا، پہلے سے حصول اجازت کے بغیر ہی ہم سیوگرام پہنچ جاتے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس شرف سے محروم لوٹے ہوں جس کے لئے ہم وہاں جایا کرتے تھے۔ ان کی بات چیت کا موضوع کچھ اس طرح ہوتا کہ وہ نوجوان عہدے داروں کے دل و دماغ پر یہ مرتسم کر دیتے کہ باوجود برطانوی سامراج کے ماتحت ہونے کے بھی اپنے ملک اور اپنی قوم کی بھلائی اور مفاد کا خیال مقدم ہونا چاہیئے۔ وہ کسی قسم کے باغیانہ خیالات کو ابھارے بنا ہی اپنے حیطۂ اقتدار اور دائرۂ عمل میں اپنی صلاحیتوں کو تعمیری کاموں میں لگانے کی سوجھ بوجھ بڑھاتے اور اپنی دل لبھانے والی

باتوں سے نہ صرف شخصیت پر چھا جاتے بلکہ دل و دماغ پر بھی۔

ان میں مزاح کوٹ کوٹ کر بھرا تھا لیکن وہ بھی سنجیدہ اور اعلیٰ۔ وہ کسی کا دل دکھائے بغیر لطافت و شیرینی پیدا کرتے اور تنقید و تعریض کے بغیر ہی بطور صلاح او سوجھاؤ ہر ایک کی اصلاح کرتے جاتے۔

ان کا خود کا کہنا تھا۔ "اگر مجھ میں مزاح کا شعور یا لطافت و ظرافت کی حس نہ ہوتی تو میں دنیا بھر کے مخالفین کا مقابلہ کرتے کرتے از کار رفتہ ہو جاتا۔ میں تو ان سب کے ساتھ نہایت خندہ پیشانی سے ہنس سکتا ہوں کہ جو مجھ پہ ہنستے ہیں۔ میری یہی صلاحیت تو مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے۔"

ان کا مشاہدہ تھا کہ جب زندگی کلیوں کی طرح چٹک چٹک کر خوشبو پھیلاتی رہتی ہے یا چمن میں موسم بہار کے ساتھ پرندوں کے گیت اور نغمے ابل پڑتے ہیں تو ہنسنا نہایت آسان ہے۔ لیکن جب ہر طرف مایوسی ہو مستقبل تاریک ہو زندگی کا بہاؤ الٹی طرف کو جلائے اور کوئی بات قاعدے اور قرینے سے نہ ہو تو ہنسنا اور خوش طبعی کا اظہار کرنا زندگی کا ایک کارنامہ ہو گا اور اسی بات پر باپو عمل پیرا اور کاربند تھے وہ بے شک محبت، زندگی اور ہنسی خوشی کے مہاتما تھے۔ ان کی صحبت میں ایسا لگتا کہ جیسے ان کی آتما ساری فضا پر چھائی ہوئی ہے اور اس میں ہم بھی سموئے ہوئے سے ہیں۔

گاندھی جی کی زندگی عوام الناس سے راست ربط رکھنے اور ان کی خدمت کرنے میں بیت گئی اسی لئے تو دنیا بھر میں وہی ایک ایسی ہستی ہیں کہ جن سے شخصی تعلقات

کا ہر شخص سچا دعویٰ کر سکتا ہے اور بے شک وہی ایک ایسی عظیم ہستی تھے کہ جن کو تمام دنیا میں زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملنے ملانے کا موقع حاصل رہا۔ اسی وجہ سے انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر طرح کے مسئلے مسائل سمجھنے کی ان کی صلاحیت کا مقابلہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ان میں عوام الناس سے محبت اور ان کے لئے کارہائے نیک کرنے کا جذبہ اس قدر موجزن تھا کہ اسی سے دھوپ بھی ٹھنڈی چھاؤں میں تبدیل ہو جاتی۔ وہ اپنی مصروفیات اور ادائیگی فرائض کے ساتھ ساتھ اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے اداس اور قنوطیت سے بھرے ماحول میں بھی خوشیاں بکھیرا کرتے۔

ان کا مزاح ہمہ گیر ہوتا اور وہ ہر ایک کو اس میں شریک کر لیا کرتے۔ ان سے جب کسی نے پوچھا کہ وہ ہمیشہ ریل کے تیسرے درجے کے ڈبے میں کیوں سفر کرتے ہیں تو انہوں نے نہایت ہی سادگی سے جواب دیا تھا "اس لئے کہ ریلوے میں کوئی چوتھا درجہ نہیں"۔ اور یہ بات تو حاضر جوابی حاضر دماغی اور شستہ مذاق میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اسے فن مزاح کی ہر کتاب کا جزو لاینفک سمجھا جاتا ہے۔

جب مہاتما گاندھی یورپ کے سفر کے دوران پیرس پہنچے تو کسٹم والوں نے ان کا سامان دیکھنا چاہا۔ اس پر انہوں نے اپنا زادِ راہ بتلاتے ہوئے کہا "میرے پاس یہ چرخہ ہے، کھانے کے برتن ہیں، بکری کے دودھ کے ڈبے ہیں، ہاتھ کے بُنے ہوئے تولیے اور دھوتیاں ہیں اور اس کے علاوہ میری اپنی شخصی شہرت ہے۔ جس کی آپ کے پاس کچھ بہت زیادہ مالیت نہیں ہو سکتی"۔

مہاتما گاندھی اپنی صحت اور تندرستی کو قدرتی طریقوں سے قائم رکھنے کے قائل

تھے۔ ان کی بیماری میں ڈاکٹر نے پینسلن کا انجکشن دینا ضروری سمجھا اور کہا "آپ یہ انجکشن لگا لیں گے تو تین ہی دن میں اچھے ہو جائیں گے ورنہ تین مہینے لگ جائیں گے"۔ گاندھی جی نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے، مجھے کون سی جلدی ہے"۔ ڈاکٹر نے اصرار کے طور پر کہا "اور جو اس بیماری کے جراثیم آپ پھیلا دیں گے"۔ گاندھی جی نے خوش طبعی سے کہا۔ "تب تو آپ یہ انجکشن اور سبھوں کو لگا دیجیے"۔

گاندھی جی جب گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن پہنچے تو ایک برطانوی اخبار کے نمائندے نے بطور طنز ان سے سوال کیا "ہندوستانیوں نے آپ کو اپنی نمائندگی کے لیے کیوں منتخب کیا ہے؟ کیا آپ سے بہتر نمائندہ انہیں نہیں مل سکتا تھا؟"۔ یہ اپنے مخصوص انداز میں ہنس کر بولے "شاید یہ بات ہو کہ ان کے خیال میں مجھ جیسا کم عقل آدمی ہی برطانیہ کے مقابلے میں بھاری ہو سکتا ہے"۔

گول میز کانفرنس سے واپسی پر لارڈ ولنگڈن نے ظاہر داری کے طور پر گاندھی جی کا استقبال کیا۔ حالانکہ پنڈت نہرو اور سرحدی گاندھی کو حراست میں لے لینے کے احکام لارڈ ولنگڈن جاری کر چکے تھے۔ جب یہ بات گاندھی جی کو معلوم ہوئی تو انہوں نے بڑے پتے کی بات کہی۔ "یہ ہمارے عیسائی وائسرائے کے کرسمس کے تحفے ہیں"۔

کسی انگریز نے ان سے رسماً پوچھا۔ "آپ کے خاندان کا کیا حال ہے؟" گاندھی جی نے فوراً جواب دیا۔ "میرا خاندان (یعنی ساری ہندوستانی قوم) بدحال ہے"۔

۱۹۳۱ء میں ریمزے میکڈانلڈ گاندھی جی سے بات چیت کرنے آئے اور اتفاقاً

اسی وقت ڈاکیہ بھی ان کے نام کے خطوط لیکر پہنچا تو انہوں نے لفظی ذومعنویت کے اعتبار سے کہا۔ "میں MAN OF LETTERS سے پہلے ملنا چاہوں گا سیاست دان تو انتظار کر سکتے ہیں۔ فی الحقیقت وہ ہمیشہ انتظار ہی کیا کرتے ہیں"۔

لارڈ مونٹ بیٹن کا بیان ہے کہ جب شہزادہ فلپس کی منگنی شہزادی الزبتھ سے طے ہوئی تو گاندھی جی بہت خوش ہوئے اور ان کو خط میں لکھا "آپ کے بھتیجے کی شادی انگلستان کی ہونے والی ملکہ سے قرار پائی ہے اس کی مجھے بے حد خوشی ہے۔ اس مبارک موقع پر میں شادی کا تحفہ دینا چاہوں گا لیکن یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ میرے پاس کچھ بھی تو نہیں ہے میں انہیں کیا دے سکتا ہوں ـ" مونٹ بیٹن نے انہیں جواب دیا "آپ کے پاس بے شک کچھ نہیں لیکن چرخہ تو ہے بس اسی کو کھڑ کھڑا یئے اور ان کے لئے کچھ بُن ڈالیے۔" گاندھی جی کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور انہوں نے ایک خوبصورت میز پوش تحفے میں دیا۔ اسی واقعے کو پرنس آف ویلیس نے گاندھی صدی کے لندن والے جشن میں نہایت ہی پُرمحبت الفاظ میں دُہرایا ہے۔

گاندھی جی لندن میں جب مقیم تھے تو چارلی چپلن ان سے ملنے گئے۔ باپو ان سے بالکل واقف نہ تھے اور انہوں نے پوچھ ہی لیا کہ یہ ممتاز شخصیت کون ہے۔ جب ان دونوں کا تعارف ہوا اور بات چیت شروع ہوئی تو کہا جاتا ہے کہ اپنی شوخ بیانی سے گاندھی جی اس مشہور عالم مسخرے کو سارا وقت ہنساتے ہی رہے۔

پونا میں آغاخاں کے محل سے نظر بندی سے چھوٹنے پر پنڈت مالویہ جی نے مہاتما گاندھی کو مبارکباد کا تار بھیجا اور لکھا

"خدا سے قوی توقع ہے کہ آپ سو سال تک جئیں گے۔ مادر وطن اور بنی نوع انسان کی خدمت کرتے رہیں گے۔" گاندھی جی ہمیشہ کہا کرتے تھے اور ان کو ایسی امید بھی تھی کہ وہ ایک سو پچیس سال کی عمر تک زندہ رہیں گے۔

اس تار کے ملنے پر انہوں نے جواب دیا

"بہ یک جنبش قلم آپ نے میری متوقع عمر سے پچیس سال گھٹا دیئے ہیں اب جو ایسا کیا ہی ہے تو یہ پچیس برس آپ خود اپنی عمر میں اضافہ کر لیجئے۔"

خود اپنے آپ کو طنز کا نشانہ بنانا بہت بڑے کردار کی علامت ہے جو بڑے سے بڑے آدمی میں کمیاب ہے۔ کسی نے مہاتما گاندھی سے پوچھا کہ آپ کا سب سے پہلا اور بڑا لڑکا آپ جیسا مدبر اور فرزانہ نہیں تو یہ اپنے آپ پر اس ریمارک کو جھیلتے ہوئے بولے۔ "میں جب جیسا تھا اس زمانے کی میری اولاد بھی ظاہر ہے اسی طرح کی ہوگی۔"

پنڈت مدن موہن مالویہ اس وقت دلی آئے جبکہ گاندھی جی کیبنٹ مشن سے ۱۹۴۶ء میں قومی وزارت کی تشکیل پر بات چیت کر رہے تھے۔ پنڈت جی کچھ بیمار سے تھے۔ (چند ہی ماہ بعد وہ سورگباشی ہو گئے) گاندھی جی کی عمر اس وقت ۷۷ سال کی تھی لیکن اپنی شگفتگی کے ساتھ پنڈت جی سے کہا کہ آپ الہ آباد واپس جائیے اور یہ کام ہم نوجوانوں پر چھوڑ دیجئے۔

گاندھی جی کی سالگرہ کے موقع پر ان کے ماتھے پر ٹیکا لگاتے ہوئے سروجنی نائڈو نے خوش مذاقی سے یہ فقرہ کسا "آج تو گاندھی جی آپ دولہا دکھائی دیتے ہیں"۔ باپو بھلا کہاں چوکنے والے تھے۔ انہوں نے نہایت ہی برجستگی سے کہا "تم دلہن جو ساتھ میں ہو"۔

آل انڈیا کانگریس کے ۱۹۲۵ کے اجلاس میں گاندھی جی صدر تھے اور انکی قیادت میں سروجنی نائیڈو اگلے سال کے لئے صدر چنی گئیں تو انہوں نے صدارت کا جائزہ دیتے ہوئے کہا "اب یہ بار میں اپنے کمزور کندھوں سے اتار کر (سروجنی نائیڈو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ان کے مضبوط مگر خوبصورت کندھوں پر ڈال رہا ہوں"۔

گاندھی جی کی لاکھوں خصوصیات ہیں۔ ان کا احساس پابندیٔ وقت بہت تیز تھا۔ انہوں نے ایک بار اپنے پوترے کانتی لال سے وقت پوچھا۔ اس نے یونہی کہہ دیا "پانچ بجے ہیں"۔ ان کی نظر جو گھڑی پر پڑی تو انہوں نے دیکھا کہ پانچ میں ایک منٹ کم تھا۔ اور ان کے پوترے نے اس فرق کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ بہت برا مانتے ہوئے بولے۔ "اگر وقت کا پورا پورا احساس نہ ہو تو گھڑی رکھنا بے کار اور لاحاصل ہے"۔ اور پھر اس طرح وضاحت کی "اگر پورے دیس کے ۳۰ کروڑ آدمی اس طرح ہر ایک منٹ کو نظر انداز کر دیا کریں تو قومی زندگی میں سے ۳۰ کروڑ منٹ ضائع ہو جائیں گے اور یہ ایک بڑا سانحہ ہوگا قومی زندگی کا، اور پھر ہمارے غریب دیس میں تو اتنا سارا وقت بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے"۔

گاندھی جی کو بال کی کھال ادھیڑنے اور بات میں سے بات نکالنے کا بھی ملکہ تھا۔ آل انڈیا کانگریس کے ۱۹۳۱ء والے کراچی کے اجلاس میں بنیادی حقوق کے متعلق تجاویز پیش ہو رہی تھیں اور یہ بات طے ہو رہی تھی کہ کسی کو پانسو روپیہ سے زیادہ ماہوار تنخواہ نہ ملے ڈاکٹر اور وکیل اس حدبندی سے باہر تھے۔ اس لئے گاندھی جی نے اس تجویز پر یہ نکتہ نکالا کہ اس میں یہ گنجائش ہے کہ ڈاکٹر انصاری اور مسٹر منشی لوگوں کو کھلے بندوں لوٹتے رہیں گے۔

پنڈت موتی لال نہرو نے اپنا رہائشی مکان آنند بھون کانگریس کو دے دیا اور اس کا نام سوراجیہ بھون رکھا گیا تو ان کو بے حساب مبارکباد کے تار اور خطوط لوگوں نے لکھے۔ گاندھی جی نے "ہریجن" اخبار میں صرف اتنا لکھا۔ "آنند بھون، جو اینٹ اور مٹی کی عمارت موتی لال نہرو نے دے دی ہے مگر یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے لخت جگر جواہر لال نہرو کو قوم کو سونپ دیا ہے۔"

مہاتما گاندھی نے اس تلخ حقیقت کو شدت سے محسوس کیا تھا کہ ہندوستان کے نوّے فیصد لوگ اتنی غریبی میں گذران کرتے ہیں کہ ان کو جسم ڈھانکنے کے لئے کپڑا بھی میسر نہیں ہوتا۔ اسی لئے انہوں نے گاندھی ٹوپی کو رواج دیا کہ کم قیمت میں سر ڈھانکنے کا سامان تو ہو اور پھر اسی احساس کے تحت انہوں نے خود بھی جسم کے اوپری حصے کو ڈھانکنے کے قمیص یا کرتے کا پہننا بالکل ترک کر دیا تھا۔ یہ کسی مدرسے میں ایک معمولی سی دھوتی اور کھلے بدن کے ساتھ گئے تو ایک امیر گھرانے کے

لڑکے نے ان سے سوال کیا۔

"آپ ہم سب کی طرح قمیص یا کرتا کیوں نہیں پہنتے؟"

اور پھر اس نے خود ہی اپنی ماں سے مانگ کر ایک قمیص لا کر دینے کی پیشکش کی۔ گاندھی جی بے اختیار مسکرا اٹھے اور نہایت ہی تحمل اور متانت سے بولے۔

"بیٹا میں ضرور قمیص پہن لیتا مگر تم جانتے ہو کہ میں ہی ایک ایسا شخص نہیں کہ جس کی بدن پر قمیص نہیں۔ اور بھی ۳۰، ۳۵ کروڑ بھائی ایسے ہیں کہ جن کو تن کا کپڑا نصیب نہیں، کیا تمہاری ماں اُن سب کے لئے یہ مہیا کر سکیں گی؟"

وردھا کے منگلواڑی آشرم کے باورچی خانے کے برتن دھونے کے فرائض گاندھی جی کے ذمے تھے۔ ایک دن ڈاکٹر جے سی کمارپا ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ جب یہ دونوں مصروفِ کار تھے، کستوربا آئیں اور ان سے یہ دیکھا نہ گیا کہ مہاتما گاندھی کا قیمتی وقت ایسے فضول کاموں میں ضائع ہو اس لئے انہوں نے برتن ان کے ہاتھ سے چھین لئے اور کہا "آپ جا سکتے ہیں، میں یہ کام کر دوں گی"۔ اس پر گاندھی جی نے کمارپا کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا "کمارپا تم بڑے خوش قسمت ہو کہ تم پر اس طرح حکومت کرنے کے لئے تمہاری بیوی ہیں ہی نہیں۔ مجھے اپنا گھریلو امن برقرار رکھنے کے لئے کستوربا کا حکم ماننا ہی پڑے گا۔"

گاندھی جی کے آشرم میں کسی نے بتایا کہ اس دن کستوربا گاندھی نے ان کے مقابلے میں تین پونیاں زیادہ کاتی ہیں، گاندھی جی نے شوشہ چھوڑا "تو کیا ہوا، وہ مجھ سے تین ماہ بڑی بھی تو ہیں۔"

سچ تو یہ ہے کہ گاندھی جی کی مزاح کی حِس نوجوانی ہی سے تیز تھی۔ جب وہ افریقہ میں بیرسٹری کر رہے تھے تو ان کے کھانا بنانے والے برہمن نوکر کے بارے میں کہا "بے شک یہ روزانہ اپنے بدن پر پانی ضرور ڈالتا ہے لیکن میں نے اس کو اشنان کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔"

سراپا پاک ہیں دھوئے ہاتھ جنھوں نے دنیا سے
نہیں حاجت کہ وہ پانی بہائیں سر سے پاؤں تک

میرٹھ میں ارملا بہن عورتوں کی لیڈر کی حیثیت سے ایک ڈپوٹیشن لیکر پہنچیں اور گاندھی جی کو تفصیل وار بتانے لگیں کہ میں نے یہ کیا ہے، وہ کیا ہے۔ گاندھی جی بغور سنتے رہے اور جب یہ کافی بول چکیں تو ان سے پوچھا۔ "آپ نے اپنے کارنامے تو بتا دیئے، اب تھوڑا بہت یہ بھی تو بتا دیجئے کہ یہ آپ کے ساتھ جو بہنیں ہیں انہوں نے کیا کیا ہے۔"

چمپارن میں کالی ماتا کی پوجا کے موقع پر آس پاس کے گاؤں والوں نے بکرے کی قربانی کی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ گاندھی جی وہاں پہنچے تو یہ جان کر ان کو بڑا دکھ ہوا۔ انہوں نے دریافت کیا۔ "بکرے کو قربانی کے طور پر کیوں دیا جا رہا ہے؟" لوگوں نے بتایا کہ کالی ماتا کو خوش کرنے کے لئے یہ قربانی دی جا رہی ہے۔

اس پر باپو نے اپنے مخصوص مدبرانہ انداز میں ارشاد فرمایا۔ اگر ماتا کی خوشنودی ہی مقصود ہے تو بکرے کے بجائے آدمی کی بھینٹ زیادہ موزوں رہے گی۔ آدمی تو بہر حال بکرے سے بہتر اور اعلیٰ مخلوق ہے۔ اور پھر باپو نے کہا۔ اگر آپ سب

راضی ہوں تو میں اس قربانی کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں۔

خلوص و محبت کے جذبات کے ساتھ پیش کیا ہوا استدلال اس قدر موثر ثابت ہوا کہ سبھوں نے جاندار کی قربانی سے پرہیز کرنے کا وعدہ کیا۔

۱۹۳۶ء میں سرسی وی رامن کی موجودگی میں سوئٹزرلینڈ کے کسی سائنسدان نے مہاتما گاندھی کے سامنے ایک سوال رکھا۔ "لامذہبیت روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور ہم میں یکجہتی اور اتفاق عنقا ہوتے جارہے ہیں۔ ایسی صورت میں لامذہبیت کا کسی نہ کسی طرح مقابلہ کیا جانا چاہیئے۔" رامن نے جواب دیا۔ "اگر خدا ہے تو پھر ہم اس کو کائنات کی لامحدود وسعتوں میں سے ضرور ڈھونڈ نکالیں گے اور اگر ان فضاؤں میں خدا ہے ہی نہیں تو اس کی تلاش کی سعی و کاوش کی زحمت ہی کیوں اٹھائی جائے۔ لوگ مجھے لامذہب سمجھتے ہیں اور حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ طبیعیات (فزکس) اور علم النجوم و سیارات میں ترقی کے باعث میں تو خدا کے وجود کا زیادہ سے زیادہ قائل ہوتا جاتا ہوں۔ گاندھی جی، میں تو سمجھتا ہوں کہ بذات خود مذاہب یکجہتی نہیں پیدا کرسکتے البتہ سائنس ہی تمام مذاہب کو ایک مقام پر لاسکتی ہے اس لئے کہ تمام سائنس دان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔"

مہاتما گاندھی نے فوراً پوچھا۔ "تو کیا اس کا تضاد بھی صحیح ہے؟ جو سائنس دان نہیں وہ ایکدوسرے کے بھائی نہیں؟"

سی وی رامن نے طنز و مزاح کو سمجھتے ہوئے جواب دیا۔ "مگر سب ہی تو سائنس دان بن سکتے ہیں۔" اس پر گاندھی جی نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔ "تب تو تمہیں

اسلام کی طرح سائنس کا کلمہ پیش کرتا ہوگا کہ جس کو پڑھ کر سب ہی اخوت اور بھائی چارے کے رشتے میں بندھ جائیں۔"

۱۹۳۲ میں لارڈ سانکے نے نیوز لیٹر میں ایک مضمون لکھا جس میں مہاتما گاندھی کے متعلق جھوٹی باتیں لکھیں جس پر ان کو بہت دکھ ہوا اور انہوں نے کہا۔"یہ مضمون شر انگیز ہے اور ہم یہ لکھیں گے کہ ان کے متعلق ہماری جو رائے تھی وہ سچ ثابت ہوگئی"۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل کی موجودگی میں گاندھی جی نے اسی مضمون کا ایک طویل خط لکھا۔ اس پر سردار پٹیل نے اعتراض کیا۔ اتنا لمبا چوڑا خط لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں نہ مختصر سے مختصر الفاظ میں یہ کہہ دیا جائے کہ لارڈ سانکے جھوٹے ہیں۔

باپو اس پر کھل کھلا کر ہنس پڑے اور کہا۔"میں نے تو اس سے بھی زیادہ سخت بات کہی ہے، وہ یہ کہ لارڈ سانکے کی یہ حرکت ایک شریف انسان کے شایان شان نہیں اور انگریز اس بات سے زیادہ ہی متاثر ہوتا ہے"۔

اپنے حساس دل سے وہ سب کی باتیں سنتے اور سمجھتے تھے اور لوگ ان سے اپنی ہر مصیبت میں مدد لیا کرتے تھے۔

ایک نوجوان نے پوچھا۔"میری بیوی کو ناجائز حمل ہوگیا ہے مگر اب وہ روتی دھوتی اور پچھتاتی ہے۔ بتائیے میں کیا کروں؟"

جواب دیا۔"اگر سچے آنسو ہیں تو معاف کر دیجیے، کیونکہ عورت پر قدرت کا یہ ظلم ہے کہ مرد کا گناہ وہ نہیں چھپا سکتی حالانکہ مرد اپنا گناہ صاف چھپا جاتا ہے"۔

ایک مشہور بت ساز خاتون گاندھی جی کے آشرم میں ان کا مجسمہ بنانا چاہتی تھیں۔

لیکن ان کو فرصت ہی نہ تھی کہ سکون سے بیٹھیں۔ ایک دن اس کے دو خوبصورت لڑکے دیکھ کر یہ بول اٹھے" تمہیں ایشور نے اتنے خوبصورت بچے عطا کئے ہیں پھر بھی تم مجسمے بنانا چاہتی ہو؟"

وائسریگل لاج میں لارڈ ارون کے ساتھ گاندھی جی سے بحث مباحثے ہو رہے تھے۔ گاندھی جی کے کھانے کا وقت ہو گیا تو انہوں نے اپنا کھانا وہیں منگوالیا اور کھانے لگے۔ لارڈ ارون نے پوچھا" میں دیکھوں تو آپ کیا کھا رہے ہیں؟" گاندھی جی نے بتائیں کھجوریں اور بکری کا دودھ اور کہا یہ وہی ہے جو حضرت عیسیٰ کھایا کرتے تھے۔"

گاندھی جی ایک بار ریل میں سفر کر رہے تھے۔ اسٹیشن پر یہ اپنے ڈبے کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ریل گاڑی آگے بڑھی تو جھٹکے سے ان کے پیر کی چپل نیچے گر پڑی گاڑی بھی رفتار پکڑ چکی تھی۔ انہوں نے فوراً اپنا دوسرا چپل بھی باہر پھینک دیا۔ ساتھیوں نے حیرت سے وجہ پوچھی تو ان کا جواب بے حد معقول تھا۔ جس کسی کو ایک چپل ملے گی تو وہ اس کے لئے بے کار ہو گی اور یہ جو میرے پاس رہ گئی تھی وہ میرے لئے بیکار تھی لہذا میں نے باہر پھینک دیا کہ جس کو پہلی چپل ملی ہے، ڈھونڈے گا تو دوسری بھی مل جائے گی۔ جوڑی ایک ہو گی۔"

مئی ۱۹۳۲ میں باپو اپنی اردو بیاض میں بڑے انہماک سے کچھ لکھ رہے تھے۔ سردار پٹیل نے کہا" باپو اگر آپ کے دل میں اس بات کی ٹھیس ہے کہ آپ نے اردو نوشت و خواند میں کچھ خاطر خواہ ترقی نہیں کی ہے تو خدا سے دعا کیجئے کہ آئندہ جنم میں اردو منشی کا روپ دے اور آپ کا بس چلے تو آپ نہ صرف ہاتھ کی انگلیوں سے، بلکہ

پاؤں کی انگلیوں سے بھی لکھنے کی مشق کر لیں۔"

مہاتما گاندھی نے جواب دیا۔"اگر میرے ہاتھ جواب دے دیں تو بے شک میں پیر کی انگلیوں سے لکھنے کی کوشش کروں گا۔"

اس سے نہ صرف ان کے عزم صمیم کا پتہ چلتا ہے بلکہ طنز کو جھیلنے اور حاضر جوابی کی غیر معمولی صلاحیتیں بھی جھلکتی ہیں۔

عمر کے ساتھ ساتھ باپو کا جسم بظاہر نحیف و لاغر ہوتا گیا لیکن اس کے اندر ایک ایسی آتما تھی جو اُن کو سچ مچ کا مہاتما بنائے رکھی تھی اور ایسے لگتا تھا کہ وہ جہاں کہیں ہوں گے وہ پوتر استھان بن جاتا، اہنسا اور محبت کا۔ اور یہی دو خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے ایک منحنی بدن کا انسان جس کے بدن پر نہ کپڑا تھا نہ جس کے پاس دنیاوی مال و دولت کا اثاثہ تھا۔ جس کی نہ کوئی ملکیت تھی اور نہ کوئی جائداد۔ اس کی حکومت تھی ساری دنیا کے لوگوں کے دلوں پر۔ اس کے بنائے ہوئے اصول دنیا بھر کی رہنمائی کا سامان تھے۔ انہیں نہ داد و تحسین کی خواہش تھی نہ وہ تنقید و تعریف سے گھبراتے تھے۔ انکو سچائی اور حقیقت کی پروا تھی اور اسکے لئے اپنی جان کی بازی لگانے کیلئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ انکا یہی راسخ عقیدہ تھا کہ دنیا بھر میں تشدد، جنگ و جدل، خون، غارتگری دیکھتے ہوئے بھی اپنے سچے اصولوں سے نہ ہٹے اور نہ انکے قدم ڈگمگائے انکا توازن ہمیشہ قائم رہا۔ انکی بات چیت میں کبھی نہ قنوطیت ہوتی تھی اور نہ یاس بلکہ انکی خوش مذاقی اور مزاح کا شعور اور حس ان حالات میں اور بھی زیادہ اجاگر ہوتے رہے لوگوں نے ان کو ایک بہترین ظریف کے روپ میں مسکراہٹیں بکھیرتے اور مشکلات کو حل کرتے ہی دیکھا۔

مسرتوں کا سرچشمہ بیربل

کیا آپ ایک ایسی دنیا کا تصور کر سکتے ہیں کہ جس میں سینما تھیٹر نہیں ریڈیو نہیں ٹیلی ویژن نہیں سرکس کا وجود نہیں میوزیم، عجائب خانے، چڑیا گھر ناپید رسٹورنٹ ہوٹل نہیں، نائٹ کلب تو کجا دِن کے کلب بھی عنقا۔ موٹر ریل گاڑی ہوائی جہاز کا نام ونشان نہیں۔

ایسا ہی تو دور رہو گا۔ اب سے سوڈیڑھ سو برس پہلے کے ہندوستان میں جو سیر و تفریح کے مشاغل تھے نیزہ بازی، چوگان، گھوڑ دوڑ، جنگی کھیل شمشیر زنی یا پھر تعیشات کے طور پر مجرے گانے ناچ رنگ کنکوے لڑانا پتنگ اڑانا، مرغ بازی، کبوتر بازی اور متوسط درجے کے لئے لوگ ناٹیہ نوٹنکی وغیرہ ان کے علاوہ گوئیے، بھانڈ، کنجر ڈوم نٹ کھٹی، بہروپیے۔ نقال عوام الناس کا دل بہلانے کے لئے گلی کوچوں میں گھوما کرتے ان کی حرکات عامیانہ، مذاق ثقہ پن سے گرا ہوا۔ جو کچھ بھی ہو یہی اس کمی کو پورا کیا کرتے۔ رئیسوں، راجاؤں، مہاراجوں کے دربار میں مصاحب ہوتے جو ہر وقت ان کا دل بہلایا کرتے۔ ان کا موڈ ٹھیک حالت میں رکھنے ان کی تفریح طبع کا سامان بہم پہنچاتے یہ کوئی کہانی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ مغلیہ دور کے شہنشاہ اکبر کے دور حکومت میں

جہاں فیضی اور ابوالفضل، راجہ مان سنگھ، عبدالرحیم خانخاناں جیسے مدبر سیاسی نظم ونسق اور عنان حکومت کو سنبھالنے والے نورتن تھے وہیں پر راجہ بیربل بھی تھے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو حکومت میں نظم ونسق برقرار رہتا نہ عدل وانصاف میں توازن، دربار کا موڈ جب تک بنا نہ رہے اور سنجیدہ ماحول میں بھی مزاح اور ظرافت کی پھلجڑیاں چھوٹتی نہ رہیں تو وہ ماحول یا تو مردہ ہو جائے گا یا پھر باہمی مخاصمت، توڑ جوڑ رشک وحسد یا رقابت جیسے فاسد مادے جڑ پکڑ کر ایک بھیانک فضا پیدا کر دیتے اس سے بڑھ کر یہ اندیشہ رہتا ہے کہ جنگ کی چنگاریاں بھڑک اٹھتیں اور حکومت کا تختہ ہی الٹ جاتا تاریخ شاہد ہے کہ دربار اکبری میں ایسے ہزاروں موقع آئے کہ بااثر اور بارسوخ امرا ایک دوسرے کی گردن قلم کرنے کے درپے تھے۔ مگر راجہ بیربل کی حاضر دماغی حاضر جوابی اور فطری بذلہ سنجی ہمیشہ آڑے آتی رہی اور سب کو جگہ پہ رکھا۔

راجہ بیربل کا پورا نام مہیش داس تھا۔ یہ ذات کے برہمن تھے مگر کہتے ہیں کہ بھاٹ تھے برہمیہ تخلص کرتے تھے۔ اور کبت کہا کرتے تھے۔ روایت ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں یہ شہنشاہ اکبر کو ایسے بھائے کہ جیتے جی کبھی جدا نہ ہوئے قرب ومصاحبت کے سوا بڑے سے بڑے عہدہ سے سرفراز ہوئے اور اکبری نورتن میں ممتاز حیثیت نصیب ہوئی پہلے تو کبت رائے۔ یعنی کبت، کہنے والے کا لقب ملا۔ راجہ بیربل کے خطاب سے سرخرو ہوئے مگر آج تک دنیا ان کو ہنسی کے سمراٹ کے نام سے یاد کرتی ہے ہندوستان کی تاریخ میں ظرافت کی کوئی قسم بذلہ سنجی کی کوئی صنف۔ حاضر جوابی کی کوئی مثال ان کی ٹکر کی نہیں ملتی۔ دربار کی سازشیں ہم عصروں کے حسد یا آپس کی چشمک نے کبھی ان کو نیچا نہیں دکھایا اور

نہ کبھی ان کی کسی بات پر ان کو پچھتانا پڑا۔ کہتے ہیں کہ شہنشاہ اکبر کسی بات پر کانگڑہ کے راجہ سے ناراض ہوئے تو اس کی سرکوبی کے لئے راجہ بیربل کو اس ریاست کا والی قرار دیا۔ اور حسین قلی خاں کو فرمان بھیجا کہ وہ ریاست ان کی تحویل میں دے دی جائے چنانچہ فوج نے یلغار کیا اور آگے آگے راجہ بیربل گورکھا ان کی فطری خوش مذاقی اور فوجی حملہ کا ایک ساتھ تصور کیا جائے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ چلاتے اور فوجیوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوں گے۔

مشکلات کے درمیان اپنی بذلہ سنجی سے سرداروں اور فوجی حاکموں کا دل بڑھاتے ہوں گے۔ الغرض محاصرہ سخت تھا۔ کانگڑہ کے راجہ نے شکست قبول کی اور راجہ بیربل کو خوب انعام اور مال غنیمت ملا یہ بے انتہا زیرک اور دانا تھے۔ اپنے چٹکلوں اور لطیفوں کے سہارے مغلیہ حکومت کی سفارت کے فرائض بھی بہ حسن وخوبی انجام دیتے کسی جوتشی نے کہہ دیا کہ پشاور کے مواد اور باجوڑ علاقہ میں افغانوں کی سرکوبی کوئی اگر کر سکتا ہے تو راجہ بیربل شہنشاہ اکبر کو ان کی پل بھر کی جدائی کبھی گوارا نہ تھی لیکن رموز سلطنت کے مدنظر ان ہی کو اس مہم پر روانہ کیا باوجود لشکر جرار کے یہ پہاڑی علاقہ میں لاپتہ ہو گئے اور پھر ان کی لاش بھی نہ ملی شہنشاہ اکبر نے غم واندوہ کے مارے کئی دن کھانا کھایا نہ پانی پیا۔ اور ایک منشور جاری کیا۔ جو ان کے رنج وغم کا مرقع ہے اس طرح یہ ایک رتن کم ہو گیا لیکن رہتی دنیا تک اپنا نام چھوڑ گیا۔ ان کا مزاج ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح تھا ان کے منہ سے نکلی ہوئی کوئی بات بذلہ سنجی سے خالی نہ تھی حاضر جوابی بلا کی تھی بے حد منچلے تھے کبھی بھی طنز ومزاح کا دار کرنے سے چوکتے نہ تھے۔ افسوس یہ ہے کہ ان کی باتیں

کسی نے جمع نہ کیں، نتیجہ یہ ہے کہ آج ڈھونڈھے سے بھی صحیح مواد نہیں ملتا۔ کیا غضب کی پہیلی کہی ہے گھی میں غرق سواد میں میٹھا۔ بن بیلن وہ بیلا ہے۔

کہیں بیربل جیتیں اکبر یہ بھی ایک پہیلا بجھے۔ (بال پوائی)

ایک دن شہنشاہ اکبر نے پوچھا گوشت کیوں نہ کھایا۔ گانا کیوں نہ گایا۔ حاضر دماغی ملاحظہ فرمایئے راجہ بیربل نے کہا۔ حضور گلا نہ تھا۔ پوچھا ہر وقت کون چلتا ہے؟ کسی نے بتایا چاند کسی نے سورج، راجہ بیربل نے کہا۔ مہاجن کا سود ہر وقت چلتا بلکہ چڑھتا رہتا ہے۔ دنیا میں ایسی کونسی شئے ہے جس کو چاند اور سورج نہیں دیکھ سکتے۔ راجہ بیربل نے کہا ہا ہر کار اندھیرے کو یہ نہیں دیکھ سکتے۔ شہنشاہ اکبر نے ایک لمبی سی لکیر بنائی اور کہا اس کو بغیر مٹائے یا گھسے اور ہاتھ لگائے چھوٹی بنا سکتے ہو؟ راجہ بیربل نے جھٹ سے اس کے برابر اس سے بھی بڑی ایک لکیر کھینچ دی اور کہا ملاحظہ فرمایئے۔ آپ کی لکیر اب چھوٹی دکھتی ہے۔ فی الفور اور فی البدیہہ کہنے کی ایسی ہزاروں مثالیں ملتی ہیں۔ بھری محفل میں ایک رئیس نے دو سینے کو چھیڑا کہ تم کو کتوں کا افسر بنانے کا حکم صادر ہونے والا ہے۔ بیربل نے بیچ بچاؤ کیا اور جس رئیس نے یہ کہا تھا ان کو لاجواب اور شرمندہ کر دیا یہ کہہ کر تب تو آپ تیار رہیئے ان کی ماتحتی کے لئے۔

ایک بار بھری محفل میں بیربل نے دعویٰ کیا کہ دنیا میں اندھے ہی اندھے لوگ بستے ہیں۔ حاضرین محفل نے برا مانا اور اصرار کیا کہ وہ اپنا دعویٰ ثابت کر دکھائیں انہوں نے ایک دن کی مہلت مانگی دوسرے دن بھرے دربار میں راجہ بیربل نے چارپائی بننا شروع کیا اس عجیب و غریب حرکت پہ شہنشاہ نے استفسار کیا۔ بیربل یہ کیا کر رہے ہو

یہ خاموش رہے تو پھر ایک یہی سوال دہرایا گیا کسی نے پوچھا بیربل یہ چارپائی کیوں بنتے ہو؟ اس دوران میں ہر سوال کرنے والے کا نام درج فہرست ہوتا رہا اور جب کافی وقت گذر گیا تو بیربل نے وہ فہرست شہنشاہ کی خدمت میں پیش کی جس میں سوائے دو ایک کے سب ہی کے نام کے آگے اندھا لکھا تھا اور سر فہرست خود شہنشاہ کا نام تھا۔ شہنشاہ برافروختہ ہوئے اور اس بدتمیزی کی وجہ معلوم کرنا چاہا۔ راجہ بیربل بولے میں تو بھرے دربار میں دن کی روشنی میں بیٹھا چارپائی بن رہا تھا۔ یہ دیکھتے دکھاتے بھی لوگ پوچھتے تھے کہ میں کیا کر رہا ہوں تو ان کو آنکھوں کا اندھا نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ دنیا میں اندھے ہی اندھے نہ ہوئے تو کون ہوئے۔ اس طرح ہر موقع اور محل کی مناسبت سے ہنسی کے سمراٹ بیربل نے ہنسنے ہنسانے کا اتنا بھاری ذخیرہ چھوڑا ہے کہ ان کو ہنسی کا سرچشمہ مانا جاسکتا ہے۔

بے ماں باپ کا آیا
سب کا باپ کہلایا

باوا آدم جب تک تن تنہا تھے، جنتی تھے۔ خالص جنتی۔ اپنی مرضی کے مالک و مختار۔ نہ کوئی ہم دم تھا نہ کوئی کینہ ساز، مونس نہ غم خوار، ان کا ماضی تو تھا ہی نہیں، مستقبل سے ان کی ذات کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے۔ نہ دکھ نہ بیماری۔ نہ غم روزگار نہ غم آلام کوئی چھوٹا نہ کوئی بڑا نہ جنسیات نہ شہوانیات، نہ حسن نہ رقیب نہ کوئی رازداں۔ فی الحقیقت جنت بے نظیر بود و باش تھی۔

ان کا لڑکپن، ان کا سن بلوغ، ان کی نوجوانی، یہ سب ایک سے تھے۔ ہر موسم خوش گوار، ہر میوہ خوش ذائقہ ہر پھول خوشبودار۔ پھر بھی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا دل کسی ہم جنس کی معیت کے لئے تڑپتا تھا لیکن ہم جنس کا کوئی تصور نہ تھا۔ پھر بھی انہوں نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق بارگاہِ خداوندی میں گڑگڑا کر عرض داشت کی۔ دوسری صبح سو کر اٹھے تو ان کے دل کی دھڑکنیں کچھ سست تھیں۔ ان کو اپنے جسم میں کچھ کمی محسوس ہوئی، مگر ہاتھ پیر، ناک کان، انگلیاں سب قائم تھیں۔ ارد گرد دیکھا تو ہر شے اپنی جگہ پر، سارا نظام جنت اپنی جگہ پر۔ صبح کا وہی دل فریب

نظارہ، خُنک ہوائیں، پھلوں پھولوں سے لدے درخت، کسی چیز کی کمی نہ تھی۔

یکایک انہیں اپنے سینے میں کچھ ہلکاپن لگا۔ سینے پر ہاتھ پھیرا تو ایک خلا سا محسوس ہوا۔ بالآخران کو پتہ چلا کہ ایک پسلی غائب ہے۔ ایک عجیب سی کسک محسوس ہوئی۔ آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ کلوروفام کی بے ہوشی سی لگی۔ یہ کچھ سنبھلے اور ہوش و حواس یکجا کئے۔ آنکھوں میں روشنی آنے لگی۔ بصارت بھی ٹھیک ہوئی تو ان کو ایک عجیب سی مخلوق سامنے نظر آئی۔ کچھ جانی پہچانی، کچھ انجانی، کچھ اپنی سی کچھ پرائی پرائی سی، کچھ شرمائی لجائی۔ معصوم اور ایک ساتھ شریر۔

مرد عورت کی یہ پہلی پہلی ملاقات تھی، اس لئے کہ آدم کی پسلی سے تخلیق کی گئی حوا نظروں کے سامنے کھڑی تھیں۔ جنس لطیف، صنف نازک، مکمل عورت وہاں پر محبت کا دیوتا کام دیو (کیوپڈ) نہیں تھا جو محبت کا تیر چلا کر پہلی نظر میں آدم کو عاشق صادق بنا دیتا۔ انہیں اپنے سینے کی باقی ماندہ پسلیوں کو اس طرح تھامنا پڑا کہ جیسے آج کی ہندوستانی فلموں کا عاشق اپنا دل تھامتا ہے اور یہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ حوا نے سوال کر ڈالا۔ تم کون ہو؟ آدم نے سوچا کہ یہ بھی خوب رہی یہ کون ہوتی ہے مجھ سے پوچھنے والی، میری اپنی جنت میں، میرے خدا کی خدائی میں۔ پھر انہوں نے ایک مہذب انسان کی طرح اپنا مختصر سا تعارف کرایا، اور پوچھا، آپ کی تعریف؟ حوا نے کہا۔ میں بھوکی ہوں، آدم سمجھے کہ یہی اس کا نام ہے۔ اور بہت دنوں تک اس کو اسی نام سے پکارتے رہے۔ رفتہ رفتہ جنسی اختلاف کے باوجود یا محض اسی وجہ سے یہ دونوں ایک دوسرے کے ہوتے گئے۔ یہاں پر ان کو بھونرا اور پھول، چاند اور چکور،

شمع و پروانہ ایسی کوئی بات سمجھنے سمجھانے کی نہ تھی، البتہ اماں حوا کی مادری زبان مسلسل چلتی رہی لاکھوں سوال ہوتے رہے۔ اور بھی کئی سوال دونوں کے دماغوں میں ابھرتے رہے لیکن مصلحت یہی سمجھی کہ ان کے حل کے لئے کسی اور موقع کا انتظار کرنا چاہیئے۔ البتہ آدم کی زبان سے ایک جملہ نکل گیا۔ آپ تو بڑی حسین و جمیل ہیں۔ آپ جیسا ہم نے تو کہیں نہیں دیکھا۔ شرم کے مارے حوا کے گال سُرخ ہو گئے۔ گال ہی کیا، سُرخی تو سارے جسم پر چھا گئی، جو اس زمانے میں با آسانی دیکھی جا سکتی تھی۔

دونوں نے مل کر سوچا، اس کے بعد کیا؟ وقت گذاری کو پھل کھاتے، چشمے کا پانی خوب سیر ہو کر پیتے ٹھنڈی چھاؤں میں درختوں کے نیچے پھولوں کی سیج پر سوتے۔ اس زمانے میں حضرت آدم ہر وقت اپنا ہاتھ سینے پر رکھے اپنی پسلیوں کو گنتے رہتے کہ ایک آدھ اور کم نہ ہو جائے۔ لیکن اس کے بعد کے دور میں حوا نے اس کی نگرانی شروع کی کہ ان کی پسلی سے کوئی اور حوا تو تخلیق نہ ہوئی ہو۔ بالخصوص آدم کہیں گھوم پھر کر آتے تو اس بات کی تحقیق ضرور کی جاتی اور جہاں سینکڑوں سوال ہوتے وہیں پر پسلیوں کا گننا بھی لازمی تھا۔

جنت بہر کیف جنت تھی، جہاں ہر قسم کے پھل پھول تھے، لیکن سیب کا ایک خاص درخت تھا جس کے اطراف کئی تختیاں لگی تھیں۔ کسی پر لکھا تھا "ہاتھ نہ لگائیے، دور رہیئے، پھل کھائیے نہیں، چکھیئے بھی نہیں" آدم تو اس کو ابتدائے آفرینش سے دیکھتے آئے تھے اور ان کی نظریں اس کی عادی ہو گئی تھیں اور پھر وہ ٹھہرے قاعدے قانون کی عزت اور پابندی کرنے والے انسان۔ لیکن حوا کے لئے یہ ایک عجوبہ تھا۔ ان

کے دل و دماغ یہ ماننے کو تیار ہی نہ تھے کہ آخر یہ سیب کا درخت اور شجر ممنوعہ کیا معمہ ہیں اور کسی پھل کے کھانے پر امتناع نہیں تو آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ آدم کے پاس ایک ہی جواب تھا، خدا جانے۔

پھر حوا نے پوچھا۔ اگر ہم اس پھل کو کھالیں تو کیا ہوگا؟

آدم نے پھر وہی خدا جانے، حوا نے تجویز رکھی کہ درخت کی شاخوں کو ہلا کر دیکھیں، کوئی پھل ٹوٹ کر گرتا ہے یا نہیں؟ آدم بڑے ضبط و نظم کے حامی اور سختی سے پیروی کرنے والے تھے، بولے ہشت، اور بات ختم ہوگئی۔

حوا کا تجسس، ذوق و شوق بڑھتا ہی گیا، وہ درخت کی طرف بہت زیادہ کھنچنے لگیں اور آدم سے بھاگنے لگیں۔ ان پر یاسیت اور قنوطیت بھری سوچ چھاگئی آدم ان کا دل بہلانے کی بہت کوشش کرتے دور دور پک نک پر لے جاتے، قدرت کے نظاروں سے بہلانے کی کوشش کرتے، پرندوں کے چہچہانے اور رنگارنگ پھولوں کی معطر خوشبو کی طرف ان کا دھیان بٹاتے، لیکن یہ ہمیشہ سیب کے درخت کی دھن میں لگی رہتیں۔ ان کو یہی دھن تھی کہ آخر کیوں نہیں؟ خیال کرتی تھیں کہ ایک آدھ پھل کو اگر وہ کھالیں تو کس کو پتہ چلے گا۔ بہت سے بہت یہی سمجھا جائے گا کہ کسی پرندے نے ہضم کرلیا۔

ایک دن جب آدم گھومتے پھرتے کہیں دور نکل گئے، حوا اس درخت کے نیچے اس کے پھلوں پر ٹکٹکی لگائے گم سم بیٹھی تھیں، اتنے میں ایک سانپ کہ جس کو افعی کہا جاتا ہے، اپنی دم کا سہارا لے کر ان کے سامنے آکھڑا ہوا، اور حوا کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔ پھر ان کی توجہ اس کی طرف ہوئی تو فرانسیسی انداز میں حوا کے ہاتھ کا اپنی لمبی زبان سے پیار لے لیا اور بولا۔ مادام آپ تو ارض وسما کی حسین ترین عورت ہیں۔ میں نے آج تک ایسی دل کشی، دل بری اور دل نوازی کسی اور میں نہیں دیکھی۔

حوا نے کہا "ہٹو بھی، تم تو ہر ایک سے یہی باتیں کرتے ہو گے۔ ، میں ایسی خوشامدی باتیں سننے کی عادی نہیں"۔ سچ میں ایسی باتیں اور کس نے کی ہونگی ان سے دل ہی دل میں بڑی خوش ہوئیں گالوں پر سرخی دوڑ گئی اور پھر گالوں سے وہ سارے جسم پر پھیل گئی، جس کو اس زمانے میں ہر کوئی دیکھ سکتا تھا۔ حوا نے سوچا یہ بھلا مانس آدم تو اس طرح کی کبھی کوئی بات ہی نہیں کرتا، وہ تو سخت بور ہے اسکے مقابلہ میں یہ مخلوق کتنی دل چسپ ہے، اور پھر ایک دم سوال کیا۔ تمہیں سیب پسند ہیں؟ سانپ نے کمر تک جھک کر بڑے ادب سے کہا کہ وہ تو اس کا مرغوب پھل ہے، اور اس کے طبی فوائد گنانے لگا، اور یہ کہاوت بھی سنائی، روز ایک سیب کھائیے اور آدم کو دور رکھیئے۔ حوا کی آنکھوں میں نمی اور منہ میں پانی تھا

سانپ نے اپنی باتیں جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں نے تو بہت سارے جہانوں کے سیب کھائے ہیں لیکن اس درخت کے سیب جیسا میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ حوا نے آبدیدہ ہو کر کہا "شاید تم سچ کہتے ہو میں نے تو چکھا بھی نہیں"۔ سانپ نے استعجاب کے ساتھ کہا کہ وہ یہ بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں اور پھر پوچھا کہ آخر وہ اس کو چکھتی کیوں نہیں، یہ تو ساری نعمتوں سے زیادہ لذیذ ہے اور جنت کا خاص پھل ہی

حوا نے انتنے سارے بورڈ جو لگے تھے وہ بتا کر کہا۔ شاید کوئی روگ آسیب لگ جائے
سانپ نے کہا میں اس زبان سے واقف نہیں جس میں یہ بورڈ لگے ہیں اور اس بات
کا تمسخر کرتے ہوئے پھر سے سیب کی خوبیاں گنانا شروع کیں۔ وٹیامن ریبوفلاون
دانتوں کے لئے فائدہ مند ہے وغیرہ، اور پھر سوال کیا۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ اس
وٹامن کے بغیر آپ دبلی پتلی کمزور ولاغر ہو جائیں، آپ کے دانت جھڑ جائیں، چہرے
پر جھریاں نمایاں ہو جائیں اور پھر حضرت آدم کو کھو بیٹھیں۔ آپ کو تو دوسرا آدم کہیں
نہیں ملے گا، ان کا کیا ہے، ان کی پسلی سے ایک اور حوا بن جائے گی۔ اتنا کہہ کر سانپ نے
اجازت چاہی کمر سے جھک کر تسلیمات بجالایا۔ ہاتھ کو پیار کیا اور الٹے پیروں لوٹ گیا۔

ادھر حوا کے دماغ پر صرف سیب ہی سیب تھا۔ بلکہ سیب کا آسیب
چڑھ گیا۔ دن رات اس سوچ میں پڑگئیں کہ یہ سانپ اگر پھر آیا تو اس کو کیا منہ
دکھائیں گی۔ آدم تو بہر صورت اپنا آدمی ہے، مگر یہ حضرت ہاتھ سے نکل گئے تو کون
دل بہلائے گا۔

ایک دن اسی سوچ میں غلطاں تھیں کہ اچانک نہ جانے کیا ہوا۔ پلک جھپکتے میں
ایک سیب ان کے دانتوں کے اندر پھنسا ہوا محسوس ہوا۔

آسمانوں میں بجلیاں کوندگئیں، بادل امڈ کر آگئے اور کڑکڑانے لگے۔ پیروں
کے نیچے زمین میں بھونچال سا آگیا۔ خود ان کے جسم میں کچھ عجیب سی کیفیت طاری ہونے
لگی اور جب یہ قیامت کا ہنگامہ کم ہوا تو انھوں نے محسوس کیا کہ وہ ننگ دھڑنگ کھڑی
ہیں۔ گھبراہٹ میں وہ سیدھی آدم کی ورک شاپ میں گھس گئیں جہاں وہ گھر گرہستی کی ضرورت

کی چیزیں خود اپنے ہاتھوں سے بنانے میں محو تھے۔ چلا چلا کر کہا۔ لو دیکھا میں نے کھالیا میں نے کھالیا۔

آدم نے مربیانہ اور مشفقانہ انداز میں مسکرا کر سوال کیا "اچھا تو کیا کھالیا۔"

اور پھر جو نظر اٹھی تو حوا کے منہ کے اندر دانتوں میں سیب پھنسا ہوا تھا۔ یہ چمک کر بولے۔ کہیں یہ اسی درخت کا پھل تو نہیں؟ اور پھر حوا کا ردعمل دیکھ کر انہیں یقین ہوگیا کہ یہ تو وہی ہے آدم غیض وغضب سے جھلا اٹھے اور پوچھا کیا تم کو اس ساری کائنات میں کھانے کو اور کچھ نصیب نہیں ہوا۔ اب نہ معلوم کیا قہر نازل ہوگا۔

حوا نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ سب کچھ انجانے میں ہوا مگر وہ ماننے کو تیار نہ تھے۔ پھر حوا نے اپنا آخری حربہ استعمال کیا اور سسک سسک کر رونے لگیں، اور آدم کا غصہ برداشت نہ کر سکیں تو اپنے منہ میں پھنسے ہوئے آدھے سیب کو ان کے منہ میں ٹھونس دیا۔ آدم کے لئے سانس لینا مشکل ہوگیا۔ اسی کشمکش میں ان کو زور کا ٹھسکا لگا اور وہ سیب ان کے حلق کے اندر اتر گیا۔

کیا کیا نہ کیئے خدا نے جتن
آدم نے مگر گناہ کر کے چھوڑا

آدم کو لگا کہ اب کوئی نئی آفت ضرور آئے گی اور انھیں بھی یہ احساس ہونے لگا کہ وہ مادر زاد برہنہ ہیں۔ وہ تو خیر ہوئی کہ حوا ان کی پسلی کا جوڑا تھیں کوئی غیر مرد یا عورت کا وجود نہ تھا۔ اس کے بعد تو سارا ماحول ہی بدل گیا جہاں پھول ہی پھول تھے۔ وہاں کانٹے بھی نظر آنے لگے۔ ہری ہری ملائم اور گداز ہریالی میں چبھنے والی خس و خاشاک

بھی آگ آئی۔ کیڑے مکوڑے رینگنے لگے۔ باغ و بہار کی جگہ ایک اجڑا ہوا دیار نظر آنے لگا۔ سانپ اس منظر سے رفو چکر ہو گیا۔

پھر مالک حقیقی نے ان دونوں کو اس اجڑتی جنت سے نکال باہر کیا۔ جب یہ زادراہ کے طور پر انجیر کے پتوں کا ڈھیر ساتھ لے کر چلے تو ان کی زبان سے نکلا۔ چلو اور جو کچھ ہو ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھی جو ہیں۔

خلد سے آدم کے نکلنے کی یہ مختصر سی کہانی ہے جب کبھی کوئی صاحب کسی جگہ اپنی عزت گنوا کر نکلتے ہیں تو غالب کے شعر کا سہارا لیتے ہیں ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

اور ہر قدم پر کشمکش حیات میں زبان سے یہی نکلتا ہے ؎

زندگی کیا ہے گناہِ آدم
زندگی ہے تو گنہگار ہوں میں

حضرت انسان کو جب کبھی فردوس بریں کی یاد ستاتی ہے تو الٹا اللہ ہی سے گلہ کرتے ہیں۔

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا!

یوں تو مبارکؒ علی کو سب ہی جانتے تھے لیکن میری ملاقات سرسری تھی۔ عیدین اور ہر مذہب و ملت کے تہوار اور بڑے دن پر یہ مبارک بادی کے کارڈ اور تحفے تحائف بالالتزام بھیجا کرتے۔ ویسے ہی ایک خوشی کے موقعے پر میں نے سوچا شخصی طور پر مل آؤں۔ اور ان کی رہائش گاہ پالی ہلز پر جا پہونچا۔ موٹر سے اترا بھی نہ تھا کہ وردی پوش نوکر نے استقبال کیا۔ اور ملاقاتی کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا۔ ابھی میں نے اپنا ملاقاتی کارڈ دیا بھی نہ تھا۔ کہ مختلف مشروبات کی ٹرالی حاضر کر دی گئی اس کے ساتھ خشک میوہ، انواع و اقسام کی بڑھیا سگریٹیں پان اور موسم گرما کی مناسبت سے عطر خس اور حنا کچھ سینٹ اور بہت سارے لوازمات پیش کر دیئے گئے۔ میں منتظر تھا، صاحب خانہ باہر تشریف لائیں۔ تو ان کے ساتھ کھانے پینے کا دور چلے۔ مگر پتہ چلا کہ وہ تو گھر پر ہی نہیں دلی گئے ہوئے ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں بھی اس خاطر تواضع استقبال اور آؤ بھگت کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ سلیقہ کی داد دیتا ہوا اپنا کارڈ چھوڑ آیا۔ اس کے بعد پھر کوئی موقعہ ہی نہ آیا۔ ملاقات کا میرا اشتیاق بازدید قائم رہا۔ اور بات رفت گذشت ہوگئی۔ مدتوں بعد بمبئی کے مشہور و معروف جوہری سے ملاقات ہوئی۔ تو انھوں نے ایک عجیب و غریب قصہ سنایا۔ کچھ دن پہلے انکی جواہرات

کی دکان پر مبارک علی آئے اور ایک بڑھیا ہیرا پسند کیا۔ اس کی قیمت کوئی سوا لاکھ انہوں نے فی الفور نقد ادا کر کے ہیرے کو خرید لیا جوہری بھی خوش تھے کہ اتنا بڑا سودا روز روز تو نہیں ہوتا۔

دو چار روز بعد مبارک علی پھر ان کی دکان پر آئے۔ اور کہا کہ وہ ہیرا ان کی بیوی کو بے حد پسند آیا ہے اور ان کی بڑی خواہش ہے کہ اس کی جوڑی کا اور ایک ہیرا مل جائے تو وہ کان کے بُندے بنانا چاہتی ہیں۔ جوہری نے مبارک علی کو یاد دلایا کہ وہ پہلے ہی کہہ چکے تھے۔ کہ ہیروں کی منڈی میں اپنی نوعیت کا وہ ایک ہی ہیرا تھا۔ اور اس کی جوڑی کا اور کوئی ہیرا ملنے کا ذرا سا بھی امکان نہیں۔ مبارک علی نے باصرار کہا کہ دنیا کے کسی کونے سے اس رنگت تراش جسامت کا ہیرا بہر صورت منگوانا چاہیئے۔ تاکہ بُندے بن سکیں۔ اور پھر کہا کہ قیمت کا کوئی سوال ہی نہیں مُنہ مانگے دام دیئے جائیں گے تاکہ بیگم صاحبہ کی فرمائش پوری ہو۔ جوہری نے حامی بھر لی کہ دنیا کے بڑے بازاروں میں تلاش کروائیں گے۔ مبارک علی نے کہہ دیا کہ وہ تین ساڑھے تین لاکھ بھی دینے کو تیار ہیں اور جلد از جلد ہیرے کی فراہمی کا وعدہ لے کر چلے گئے۔ جوہری نے ہر جگہ تار اور کیبل کروا دیئے۔ اور دنیا کے تمام جوہریوں سے اس فرمائش کی تکمیل کے لئے ممکنہ سعی کرنے کی التجا کی گئی۔

جوہری نے مجھے بتایا کہ بدقت تمام اس قسم کا ہیرا رنگون کے بازار میں دستیاب ہوا اور اس نے پونے تین لاکھ میں خریدی کر لی اس اُمید میں کہ مبارک علی سے خرچہ کی منہائی کے بعد تا بحد امکان منافع حاصل کر لے۔ رنگون سے وہ خاص ہیرا بمبئی کے جوہری

کی دکان پر لایا گیا۔ تب تو انہوں نے صاف پہچان لیا کہ یہ تو وہی ہیرا ہے جو انھوں نے مبارک علی کے ہاتھ سوا لاکھ روپے میں بیچا تھا اور اب پونے تین لاکھ میں مبارک علی کے کارندوں نے اسی کو الٹا ان کے گلے چیپ دیا۔ اسی دن سے وہ مبارک علی کے انتظار میں ہیں۔ کہ وہ ہیرا خرید کر لے جائیں۔ اور اپنی بیگم کی فرمائش پوری کریں۔ کوئی قانونی چارہ جوئی بھی ممکن نہ تھی۔ کہ بظاہر کوئی امر قابل گرفت نہ تھا۔

چنانچہ مجھے بعد میں پتہ چلا اور تفصیلات معلوم ہوئیں کہ مبارک علی اس کے کاروبار اور جعلسازیوں سے دولت کما رہے ہیں۔ ان کا دماغ اس قسم کے کاروبار میں خوب چلتا ہے۔ انھوں نے اپنے کارندے کو سکھائی ہوئی تجویز کے مطابق ایک اور جوہری کی دکان پر بھیجا۔ خوب جانچ پڑتال کے بعد موتیوں کا ایک خوب صورت سا ہار پسند کیا اور منہ مانگے دام ۲۵ ہزار روپے نقد ادا کیے۔ دکان دار رسید کاٹنے لگا تو یہ بڑی شد و مد کے ساتھ کہنے لگے۔ اس کی قطعی ضرورت نہیں بلاوجہ سیلس ٹیکس وغیرہ کے جھگڑے پڑیں گے اور دکان سے چلے گئے۔ دکان دار نے ۲۵ ہزار کے نوٹوں کو بڑی حفاظت سے اپنی تجوری میں بند کر کے رکھا۔ اور کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک اور خوش پوش اور وضعدار صاحب بڑے رعب داب کے ساتھ دکان میں داخل ہوئے اور بہت سارے زیور دیکھے مگر پسند کیا ایک ہی ہار جس کی قیمت بھی ۲۵ ہزار روپے ہی تھی۔ دکاندار سے اس کا خوبصورت ڈبہ بھی لیا۔ رسید بنوا کر لے لی۔ اور اپنے ساتھی کو لے کر جانے لگے تو دکاندار نے بڑے ادب سے یاد دلایا۔ کہ اس ہار کی قیمت تو ادا ہوئی ہی نہیں۔ اس پر یہ بہت بگڑے۔ اور چیخنا چلانا شروع کیا کہ کیا دھوکہ بازوں کی دکان ہے

قیمت کی ادائیگی کے باوجود بھی یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ دام ادا نہیں ہوئے۔ دن دہاڑے یہ جعلسازی۔ اسی درمیان میں ان کے ساتھی قریب کے پولیس اسٹیشن سے انسپکٹر کو بلا لائے اور اس کو انھوں نے اپنی کہانی دہراکر کہا یہ دیکھئے رسید موجود ہے اور میں نے جو ۲۵ ہزار روپے ادا کئے ہیں وہ ابھی ابھی تجوری میں بنڈل بنا کر رکھے گئے ہیں۔ اور ان نوٹوں کے نمبر ملائے گئے تو برابر مطابقت اور پھر ان ۲۵ ہزار روپوں کا کہیں اور داخلہ نہیں کوئی رسید نہیں۔ وہ تو پیش بندی مبارک نے پہلے ہی سے کر لی تھی کہ نہ وہ پہلی رقم حساب کتاب میں جائے اور نہ اس کی رسید بنے۔ نوٹوں کے نمبر تو معلوم ہی تھے دکاندار کی بڑی سبکی ہوئی۔ نہ معلوم پولیس سے کس طرح گلو خلاصی ہوئی۔

کہتے ہیں اس سے قبل مبارک علے کلکتہ میں کسی موٹروں کے شوروم میں گئے جو کافی مشہور و معروف تھا بڑے طمطراق سے گئے دو چار مصاحب بھی ساتھ میں تھے جو ایک رولز رائس موٹر کے انتخاب میں پیش پیش تھے۔ صلاح و مشورہ کے بعد ۶۰ ہزار میں سودا طے ہوا اور انھوں نے اسی قدر رقم کا چیک دینا چاہا۔ مالک نے کچھ پس و پیش کیا اور کچھ کوشش بھی کی کہ بنک سے ان کا کھاتہ کا پتہ کرے۔ لیکن ہفتہ ہونے کی وجہ سے بنک سے مدد نہ مل سکی۔ دوکان دار نے سوچا ایک دن اتوار کا بیچ میں ہے اس عرصہ میں یہ گاہک معہ رولز رائس کے کہاں غائب ہو سکتا ہے یہ سوچ کر اس نے چیک قبول کر لیا اور موٹر حوالے کر دی البتہ بہ نظر احتیاط ایک جاسوس کو ان کے پیچھے لگا دیا۔ کہ چیک کے کیش ہونے تک ان پر نظر رکھے۔ چنانچہ مبارک علے رولز رائس لے کر چلے تو یہ بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ ادھر ادھر گھوم پھر کر مبارک علی ایک اور

موٹر کار ڈیلر کے پاس پہونچے۔ نئی خریدی ہوئی گاڑی کو کچھ کم میں فروخت کیا اور قیمت لے کر سیدھے ایرپورٹ کا رُخ کیا۔ جاسوس نے دیکھا کہ بظاہر تو یہ بڑی چال ہے اس لئے اس نے اپنے لگائے ہوئے مالک کو فوراً صورت حال سے مطلع کیا۔ وہ بیچارہ تو پہلے ہی سے غم کھا رہا تھا سیدھا کوتوالی کے تھانہ پر پہونچا اور ساری رُوداد سُنا کر اپنے شبہ کا اظہار کیا کہ مبارک علی جھوٹا چیک دے کر راہ فرار اختیار کر رہے ہیں۔ حالات کچھ ایسے ہی بنتے گئے۔ پولس کو معاملہ کی نزاکت کے لحاظ سے مبارک علی کے خلاف احکام صادر کرنے پڑے کہ وہ کلکتہ چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ مبارک علی نے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے اس حکم کے سامنے سر جھکا دیا۔ اور پیر کے دن بینک کھلنے کا انتظار ہوتا رہا۔ اور پھر پیر کے دن دکاندار کے نام کا ۶۰ ہزار کا چیک بنک نے قبول کر کے ساری رقم ادا کر دی۔ مبارک علی اس مبارک گھڑی کی تاک میں کب سے تھے۔ انھوں نے فوراً ہی دکان دار کو دھمکی دی کہ چیک تو قبول کر لیا گیا اور اس کو رکوا کر سارے کام خراب کر دیئے گئے اور ان کا کام بگاڑ دیا۔ اس لئے ازالۂ حیثیت عرفی کے لئے ۵۰ ہزار روپے کا ہرجانہ طلب کیا۔ دکان دار نے اپنی شہرت بگڑنے کے ڈر سے فوراً ۵۰ ہزار روپے ادا کر دیئے۔ اور مبارک علی کو رولز رائس تقریباً مفت میں پڑی۔

یہ تو ان کے بڑے کارنامے تھے لیکن چھوٹے موٹے طریقہ پر بھی ان کی حاضر دماغی کام کرتی رہتی۔ ایک بار یہ اپنی کار میں جا رہے تھے۔ ٹریفک کی کسی غلطی کی وجہ سے پولس والے نے انھیں روک دیا اور ان کو عدالت میں پیش کرنے کے لئے ان کا لائسنس

روکنا چاہتا تھا۔ انھوں نے اس سے بڑی منت کے ساتھ التجا کی جو کچھ انعام بخشش چاہیے لے لو اور ہمیں عدالت کے جکڑا اور جھنجھٹ میں نہ ڈالو پولس مین راضی ہوگیا۔ اور لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لئے ان کو کہا کہ سامنے کی پان والی دکان پر پانچ روپے دے کر چلتے بنو۔ یہ فوراً سامنے والی پان کی دکان پر جو کچھ فاصلے پر تھی پہونچے۔ اور دکان دار سے کہا کہ میں نے تمہارے دوست پولس مین کو دس کا نوٹ دیا ہے اس کو صرف پانچ دینے تھے اور اس کے پاس کھلے روپے نہیں تھے۔ اس لئے اس نے تم سے ۵ روپے بقایا لے لینے کے لئے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ اور پھر دور ہی سے پولس مین کو پانچ انگلیاں بتا کر پانچ کی تصدیق کے طور پر دکاندار کو بتایا۔ ظاہر ہے کہ پولس مین نے پانچ ہی روپے مانگے تھے۔ اس نے بلا کچھ سوچے سمجھے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پان والے نے ان کے اس اشارے کو کافی سمجھ کر مبارک علی کو پانچ روپے دے دیئے۔ اور یہ بجائے اپنی جیب سے پولس مین کو پانچ روپے دینے کے الٹے اس سے پانچ روپے بٹور لئے اور یہ جا وہ جا۔

اس قسم کی چھوٹی موٹی شرارت کرنے اور دو پیسے بچانے کا ان کو بہت شوق تھا۔ ایک بار یہ اپنے ایک دوست کے ساتھ ایک معمولی سی ایرانی ریسٹورنٹ میں پہونچے مگر دونوں بالکل الگ الگ کہ جیسے ایک دوسرے کو جانتے ہی نہ ہوں۔ اور دور دور میزوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے دوست نے صرف چائے کا آرڈر دیا۔ اور یہ خوب سیر ہو کر مرغ پلاؤ کباب اور بہت ساری اچھی اچھی چیزیں کھا گئے اور چپکے سے دوست کو اپنا بل پکڑوا دیا اور اس کا صرف ۲۵ پیسے والی چائے کا بل لے کر کاؤنٹر

پر پہونچے اور ۲۵ پیسے ادا کر کے باہر نکل گئے۔ جب یہ جا چکے تو ان کے دوست نے بیرے کو بلا کر چیخ پکار شروع کی کہ انھوں نے تو صرف چائے پی ہے اور یہ مرغ پلاؤ کباب بیٹھے وغیرہ کا ۱۲ روپے کا بل ان کو کیوں دیا گیا۔ بیرا بھی پریشان ہوا۔ مالک بھی بیرے کی غلطی سمجھ کر بات کو رفع دفع کرنا چاہتا تھا۔ انھوں نے بیرے سے تصدیق کرائی کہ انھوں نے صرف ۲۵ پیسے کی چائے ہی تو پی تھی۔ یہ مان لیا گیا کہ دوسرے گراہک کا بل ان کو بھولے میں دے دیا گیا ہے اس لئے ان سے بھی صرف ۲۵ پیسے لئے گئے۔ اور مبارک علی سستے چھوٹے۔

ایک دفعہ یہ ریل کے سفر پر چلے اسٹیشن پر قلی کو پیسے دیئے اور کچھ کتابیں خرید کر قیمت کی ادائی کے لئے ہر بار یہ اپنا بٹوہ نکالتے تو نوٹوں سے بھرا ہوا لوگوں کی نظر میں پڑتا۔ ایک گرہ کٹ چور نے دیکھا کہ یہ تو ہزاروں کی اسامی ہے اور اسے لگا کہ بے پرواہ بھی ہے وہ بھی بالآخر فوراً ہی ٹکٹ کٹا کر اسی ڈبہ میں ساتھ آگیا۔ رات ہوئی تو گرہ کٹ نے سوچا کہ یہ سو جائیں گے تو بڑا اچھا موقعہ رہے گا ان کا بٹوہ لینے کا اور اسی انتظار میں اپنی سیٹ پر پڑا پڑا سونے کا بہانہ کیا۔ ادھر یہ بھی سو گئے تو اطمینان کر کے چپکے سے اٹھا اور ان کے ٹنگے ہوئے کپڑوں، اِدھر اُدھر بکھری ہوئی چیزوں اور بستر کے نیچے۔ غرضکہ ہر جگہ ممکن تلاشی لی لیکن اتنا بڑا سا بٹوہ روپیوں سے بھرا کہیں ملا ہی نہیں۔ رات بھر اپنی سی کوشش کرتا رہا لیکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ باوجود اس کے اس فن میں ماہر تھا اس کو کچھ نہ لگا اس کا بے حد داغ رہا۔ صبح ہوئی منہ ہاتھ دھو کر بیٹھا تو مبارک علی چائے اخبار ناشتہ کے لئے بار بار وہی بٹوا اپنے تکیہ

کے نیچے سے نکال رہے ہیں اور بلینوں کی ادائی کر رہے ہیں۔ اس نے تو رات کو تکیہ بستر اور سیٹ سب ہی خوب چھان مارا تھا اور وہاں پر بٹوہ تھا ہی نہیں مگر یہ ہار ماننے والا نہ تھا اس کو پتہ چل گیا کہ اب صبح یہ اسٹیشن پر اتر کر پھر اسی رات لوٹنے والے ہیں۔ اس نے سوچا کہ دوسری رات اپنی قسمت اور اپنا ہنر آزمانا چاہیئے اور پھر اس نے بھی بہانا کر کے دن بھر وہیں کہیں گذارا اور رات کو پھر ساتھ ہو گیا۔ اس بار وہ زیادہ تیاری سے آیا دونوں ایک ہی کمپارٹمنٹ میں پھر سے ساتھ ہو لیئے۔ رات ہوئی سب جدہر کے ادھر ہوئے۔ ریل اپنی تیز رفتاری سے چلنے لگی اور جب مبارک علی گہری نیند سو گیے تو اس نے کلوروفارم سنگھا کر بالکل بیہوش کر دیا اور بڑے اطمینان سے ان کی ہر چیز کی تلاشی لی حتیٰ کہ صندوق بھی کھول کر ایک ایک چیز کی تہہ میں ڈھونڈھ ڈالا۔ کمپارٹمنٹ، باتھ روم، پنکھے، سوٹ، گدے فرش کوئی جگہ نہ تھی کہ جہاں اس نے ڈھونڈھا نہیں۔ رات بھر اسی کوشش میں گذر گئی لیکن بٹوا کا کہیں پتہ ہی نہیں، اور وہ بھی ایسی کوئی چھوٹی چیز نہیں کہ گم ہو جائے صبح تک مبارک علی پر سے کلوروفارم کا اثر بھی دور ہو گیا اٹھے اور دونوں نے ہی باری باری سے باتھ روم استعمال کیا۔ چائے کا آرڈر کر کے بیٹھ گئے۔ تو مبارک علی کے ہاتھ میں وہی روپوں سے بھرا ہوا بٹوہ۔ اب تو اس سے رہا نہ گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑے اور بڑے ادب سے کہا کہ میں گرہ کٹ جیب کتروں کا سردار ہوں اور میری عمر تمام اسی کام میں گذری اس کام میں مہارت تامہ اور ید طولیٰ رکھتا ہوں ہاتھ قینچی کی طرح چلتا ہے۔ نظر بھی تیز ہے۔ اب آپ اتنا بتا دیجئے کہ میری دو رات

کی محنت کس طرح اکارت ہوئی۔ کیا راز ہے کہ بٹوہ ہاتھ لگتا ہی نہ تھا۔ ایسی کون سی جگہ ہے جہاں آپ چھپا سکتے ہیں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ مجھے یہ راز ضرور بتا دیجئے میں تمام عمر آپ کا نہ صرف احسان مند رہوں گا بلکہ آپ کے لئے کچھ بھی کرنا ہو تو میں اس میں دریغ نہ کروں گا۔

مبارک علی خوب ہنسے اور کہا کہ وہ تو میں نے ایک نظر میں تاڑ لیا تھا کہ آپ کون ہیں اور آپ کے ارادے کیا ہیں۔ اس لئے میں نے اپنا بٹوا رات سوتے وقت آپ ہی کے تکیہ کے نیچے رکھ چھوڑ دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ سب ہی جگہ ڈھونڈھ لیں گے مگر اپنے تکیہ کے نیچے تو وہم و گمان بھی نہ ہوگا اس طرح پر انھوں نے ایک بڑے گرہ کٹ کو اپنا مطیع بنا کر رکھا تھا اور اس سے اکثر و بیشتر کام لے لیا کرتے تھے جو ان کی استادی کو مان کر بڑی خوشی سے سب کچھ کرتا۔

ان کے ایک دوست کے پاس ایک گھوڑا تھا جو اتفاق سے ہر گھوڑ دوڑ میں جیت رہا تھا۔ مبارک علی کو خواہش ہوئی کہ یہ گھوڑا خرید لیں اور کچھ روپیہ کمائیں انہوں نے ۵۰ ہزار قیمت کا آفر دیا۔ لیکن وہ دوست کسی حال راضی نہ ہوتا تھا۔ ایک دن اس گھوڑے کے مالک نے صبح صبح اصطبل میں اپنے گھوڑے کو مردہ پایا۔ اس کی نیت میں فتور آیا اور اس نے مبارک علی کو اس سانحہ کی اطلاع نہ دیتے ہوئے ان سے سودا طے کر کے ۵۰ ہزار روپے نقد لے لئے اور اصطبل کی چابی اور دوسرے کاغذات حوالہ کر کے فوراً ہندوستان سے باہر نکل گیا۔ چار چھ ماہ بعد خوب تفریح کر کے ندامت کرتے ہوئے ضمیر کے ساتھ لوٹا تو کلکتہ میں مبارک علی سے مڈبھیڑ

ہوئی۔ یہ کترا کر جانے لگے کہ ان کو کیا منہ بتائیں لیکن مبارک علی بڑی گرم جوشی سے ملے۔ اور نہایت ہی تپاک سے مصافحہ کیا۔ ان کے دل میں چور تھا اور یہ ڈرتے تھے کہ جھگڑا ہوگا۔ قانونی چارہ جوئی اور شاید قیمت ہرجانہ کے ساتھ لوٹانا ہوگا۔ لیکن مبارک علی کی صاف دلی کو دیکھ کر انھیں اطمینان ہوا اور ہمت باندھ کر انہوں نے پوچھا کہ اس گھوڑے کا کیا ہوا مبارک علی نے کہا "دوست اس گھوڑے نے تو مجھے ۵۰ ہزار کا منافع دیا۔ میں نے اس کو ایک لاکھ میں فروخت کر دیا۔ دوست نے حیرانی سے پوچھا "ارے یار وہ تو شاید مر چکا تھا۔" مبارک علی نے قطع کلام کر کے کہا "یہ بات تو صرف تم کو یا مجھ کو معلوم تھی اور تو کوئی جانتا نہ تھا۔ قبل اس کے کہ اوروں کو علم ہو میں نے اس پر لاٹری کے ٹکٹ لگائے۔ اور سو سو کے ہزار ٹکٹ بیچ دیئے اسی دن"۔ دوست نے پوچھا "پھر جس کے نام لاٹری نکلی وہ تو ـــ" مبارک علی نے کہا بے شک اس نے ہنگامہ کیا مگر میں نے اس کے سو روپے واپس کر دیئے۔

شیخ چلی

شیخ چلی کو کون نہیں جانتا۔ یہ حضرت ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ ہر رنگ اور ہر روپ میں ان سے مڈبھیڑ ہوتی رہتی ہے۔ جانے ان جانے بھی ان سے ملنا ہو ہی جاتا ہے یہ اتنے ہر دلعزیز ہیں کہ ان کے بغیر کوئی محفل کوئی اجتماع کوئی خلوت منعقد نہیں ہو سکتی لطف یہ کہ مذہب ذات پات ریاستی اور لسانی جھگڑوں سے پاک صاف خوش فکر خوش طبع مست اور مگن۔ یاسیت یا قنوطیت ان کے قریب نہیں پھٹکتی۔ بیماری ان سے پناہ مانگتی ہے۔ ان کو غم روزگار ستاتا ہے نہ غم آلام کا یہ شکار ہوتے ہیں۔ یہ اپنی محبت میں کبھی ناکام نامراد نہیں۔ فراق کی آگ میں نہیں جلتے انتظار اور شب ہجراں ان سے کوسوں دور۔

آپ حیران ہوں گے کہ یہ کون بزرگوار ہیں جن کا میں تذکرہ کرنے چلا ہوں۔ ویسے تو آپ اس شہرۂ آفاق ہستی سے ضرور واقف ہیں کہ جو ہمیشہ ہوائی قلعے بناتی ہے ہوائی محل میں رہتی ہے خیالی پلاؤ پکاتی ہے۔ ان کی کل آج ہی ہو جاتی ہے اور ان کی ٹانگ ہر چیز میں اڑی رہتی ہے۔

ہر صبح اخباروں میں کسی نہ کسی روپ میں ان کی تصویر نظر آتی ہے۔ کبھی

بیتا کی شکل میں کبھی کسی حکمراں کبھی سائنس داں تو کبھی پروفیسر یا اڈمنسٹریٹر کی صورت میں یہ کبھی ہمیں بتا رہے ہوں گے کہ فلاں یوجنا کے بھروسے ہم بہت جلد خود مکتفی ہو جائیں گے نہ غلّہ نہ مشنری نہ اور کوئی چیز درآمد کرنا ہوگا نہ کبھی ہماری فصلیں فیل ہوں گی نہ ہم کو خشک سالی یا قحط کا سامنا کرنا ہوگا۔ ہاں یہ محض باتیں ہی نہیں بنائیں گے۔ سارے اعداد وشمار ذرائع کے جملہ حوالے اور تفصیلی معلومات بھی فراہم کریں گے۔ ان کا کام ہی یہی ہے کہ مستقبل کی خوش آئند تصویریں پیش کرتے رہیں جو رنگین بھی ہوتی ہیں۔ دیدہ زیب دل فریب اور مسحور کن بھی۔

یہی تو ہیں شیخ چلی! یہ آپ کے ہمارے سب کے دماغ میں موجود ہیں اور اگر کوئی اپنے دل و دماغ میں ڈھونڈھے تو یہ ضرور کسی گوشہ میں چھپے ہوئے نہیں بلکہ روشن و آشکارا ملیں گے ان کی عمر بھی دراز ہے۔ نہ معلوم کب سے جی رہے ہیں اور زمانہ کی سرد گرم کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں خود مصیبتیں اٹھاتے ہیں لیکن دوسروں کے لئے سامان ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ حوصلہ ہمت اور بڑھاوا دیتے ہیں اور جینے کا سلیقہ بھی عطا کرتے ہیں۔

کل ہی کی بات ہے رندھیر اور ان کی بیوی ہم سے برسوں بعد ملے اور باتوں باتوں میں ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے۔ رندھیر کی خواہش تھی کہ ان کا لڑکا انجینیر بنے اور شریمتی جی چاہتی تھیں کہ وہ ڈاکٹر بنے پر زور دلائل سے ایک یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ملک کو نوجوان انجینیروں کی سخت ضرورت ہے اور دوسرے کا یہ استدلال تھا کہ ڈاکٹروں کی کمی ہے کہ جو دیہات میں کام کریں بحث جب بہت زیادہ گرم ہونے

لگی تو ہم نے کہا کہ ارے بھئی اپنے لڑکے سے بھی تو پوچھا ہوتا کہ اس کی مرضی اور اس کا رجحان کیا ہے؟ اس پر ہمیں کیا جواب ملا بتائیں آپ کو؟ جی ہم کو بتلایا گیا کہ ابھی ان کے کوئی لڑکا ہوا ہی نہیں۔ یہ ان کے من میں جو شیخ چلی بسے ہوئے ہیں وہ اس بحث وتکرار کے ذمہ دار ہیں۔

اصلی شیخ چلی سے آپ کو ملائیں۔ دیکھئے وہ سامنے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہیں کہ ان کے سامنے کانچ کے برتنوں کا ٹوکرا رکھا ہے ٹھہریئے انہیں چھیڑیئے نہیں ذرا سنیں تو سہی وہ کس ادھیڑ بن میں ہیں اور دل ہی دل میں کیا کہہ رہے ہیں؟ انہوں نے اپنی ساری جمع پونجی اکٹھی کر کے یہ کانچ کے برتن خریدے ہیں اور اب یہ سوچ رہے ہیں کہ سو روپے کے سرمایہ سے خریدے ہوئے برتن دو ایک روز میں دو سو روپے میں بیچ دیں گے۔ اس رقم سے اور برتن خریدیں گے جو چار سو روپیہ میں بک جائیں گے اس طرح دو ایک مہینے میں وہ دو ہزار روپے جمع کر کے ایک چھوٹی سی دوکان کریں گے اس سے چار چھ مہینہ میں اتنا منافع ہوگا کہ دکان کے ساتھ ساتھ ایک گھر بھی کر لیں گے جس میں ان کی بیوی بچے ٹھاٹھ سے رہیں گے۔ یہ بھی سوچ رہے ہیں کہ ان کے بیوی بچے اگر کام نہیں کریں گے اور سستی یا کاہلی برتیں گے تو یہ ان کو ایک زبردست لات ماریں گے۔ یہ سوچتے سوچتے انہوں نے جو زور سے لات جمائی تو سامنے رکھے ہوئے ٹوکرے کے سارے برتن چھن چھن ٹوٹ گئے۔ دیکھا آپ نے شیخ چلی کا اصلی روپ۔ انکی زندگی ہمیشہ اسی طرح بسر ہوتی ہے لیکن یہ کبھی ہمت نہیں ہارتے سال رواں کی کوئی مہم کسی وجہ سے ناکام ہو تو کیا ہوا آئندہ سال اس کے اگلے سال اس کے آگے یقیناً کامیابی ہوگی۔

اپنے منہ میاں مٹھو

آپ نے دیکھا ہوگا کہ سٹرک چلتے کوئی پھسل کر گرتا ہے یا گزرتی ہوئی موٹر گاڑی کسی پر کیچڑ اچھال دیتی ہے تو دیکھنے والے خوب ہنستے ہیں کسی میں کوئی عیب ہو کوئی کمزوری ہو یا کوئی خامی ہو کسی کا قد چھوٹا ہو کوئی لنگڑا ہو لولہ ہو تو اس کی ہنسی اڑائی جاتی ہے اس پر طنز و استھزاء کے وار ہوتے ہیں۔ کوئی دماغی کمزوری میں مبتلا ہو کسی کے حواس تیز نہ ہوں تو اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اسی لئے اکثر لوگ اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈھانکنے اور اپنے عیوب کو چھپانے کے لئے ڈینگیں مارتے ہیں تعلی سے کام لیتے ہیں اور خود ہی اپنی بڑائی ہانکتے ہیں مبالغہ کے ساتھ اپنے کارنامے سناتے ہیں، جو زیادہ تر من گھڑت کہانیاں اور قصے ہوتے ہیں اس کے پیچھے بڑی حد تک ان کا احساس کمتری ہوتا ہے جس کو وہ احساس برتری کے روپ میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں اور اپنی دفلی پر اپنا راگ الاپتے ہیں شیخی بگھارتے ہیں۔ بڑی بڑی باتیں بناتے ہیں۔ ایسے لوگ آج کل کی سوسائٹی میں بالکل برداشت نہیں کئے جاتے ایک لحظہ کے لئے بھی ان کی بڑائی کوئی سننا نہیں چاہتا ان کو لوکا خطاب دیا جاتا ہے۔

اگر یہ دانشوروں اور صاحب فہم لوگوں کی محفل میں ہوں تو ان کی باتوں کو کچھ اس طرح توڑ مروڑ کر ان پر فقرے کسے جاتے ہیں کہ سوائے شرمندگی اور خفت کے ان کے لئے کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔

راجن اسی طرح اپنی دفلی بجا کر اپنا راگ الاپتے تھے۔ ہمیشہ اپنی بات اس جملہ پر ختم کیا کرتے۔ آپ کو پتہ نہیں کہ میرے باپ دادا کون تھے؟ لوگ ان کی اس بات سے تنگ آ گئے تھے۔ ایک دن کسی نے فقرہ کس دیا۔ ہم تو نہیں جانتے مگر کیا آپ بھی نہیں جانتے کہ آپ کے باپ کون تھے؟

حمید بھی کچھ اسی طرح کی لاف گزاف کے عادی تھے اور اپنی دولت و ثروت کا رعب گانٹھنے کے لئے کہا کرتے تھے "میرے باپ جب مرے ہیں تو انہوں نے دو کوٹھیاں چار بنگلے ایک فیکٹری اور بہت سارا بینک بیلنس چھوڑا رشید نے ان سے الٹ کر پوچھا شاید آپ نہیں جانتے کہ میرے باپ کا جب انتقال ہوا تو انہوں نے کیا چھوڑا جب حمید نے لاعلمی کا اظہار کیا تو رشید نے تنگ کر بتایا ارے صاحب میرے باپ جب مرے ہیں تو وہ میرے لئے ساری دنیا ہی چھوڑ گئے۔

ایک اور صاحب اسی طرح ڈینگیں مارا کرتے تھے اپنی بڑائی بہت زور و شور سے جتایا کرتے۔ ایک دن کہنے لگے۔ مجھے شکار کا بڑا شوق ہے اور میرا نشانہ بھی اتنا اچھا ہے کہ آج تک کبھی خطا نہیں ہوا۔ بندوقیں بھی ایک سے ایک بڑھیا ہیں اور پھر سنانے لگے کہ وہ ایک بار شکار کے لئے لق و دق جنگل میں تن تنہا جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک خونخوار اور ہیبت ناک شیر آتا ہوا دکھائی دیا۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے بندوق

کندھے سے لگائی اور گولی چلادی۔ شیر وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اتنے میں ان کی نظر
بیدھی طرف اٹھی تو ایک اور شیر نظر آیا۔ انہوں نے اپنی دوسری گولی سے اس کا بھی کام
تمام کیا۔ اب جو کچھ سنبھلے تو بائیں طرف سے ایک اور شیر جھپٹ کر آیا۔ اس پر یہ گولی
چلانا چاہتے تھے۔ دیکھا توان کی گولیوں کا اسٹاک ختم ہوگیا اور یہ۔ یہاں تک انھوں
نے اپنا قصہ سنایا ہی تھا کہ کسی نے لقمہ دیا۔ تو پھر آپ کی آنکھ کھل گئی ہوگی۔

ایک حکیم صاحب بتا رہے تھے کہ وہ خاندانی حکیم ہیں ان کے دادا نے ایسے
نایاب نسخے تیار کر رکھے تھے کہ ہر بیماری کا علاج بآسانی کر سکتے تھے کبھی کوئی مریض
ان کے مطب سے مایوس نہیں گیا۔ ان کے پاس ایک غیر معمولی اور نہایت ہی مجرب
مرہم بھی تھا کسی کا کان کٹ کر گر جائے ہاتھ یا پیر کٹ کر الگ ہو جائے تو اس مرہم
کے استعمال سے نیا کان نیا ہاتھ یا نئی ٹانگ خود بخود پیدا ہو جاتے ۔ اس قسم
کی ان ہونی باتیں یہ بیان کر کے اپنے منہ میاں مٹھو بنے جا رہے تھے اس پر ان کو کسی نے
بتایا کہ یہ تو بہت پرانی بات ہوگئی۔ آج کل تو امریکہ میں ایسی دوائیاں اور ایسے انجکشن
ایجاد ہوئے ہیں کہ اگر میدان جنگ میں یا کسی ناگہانی حادثہ میں کسی کی ٹانگ یا ہاتھ
کٹ جائے اور اس آدمی کا دھڑ نہ ملے تو اس بچی ہوئی ٹانگ یا بچے ہوئے ہاتھ پر
یہ دوا لگا دی جاتی ہے اور وہ آدمی سالم کا سالم اس ٹانگ یا ہاتھ سے جڑا ہوا بن کر
تیار ہو جاتا ہے ہو بہو اس آدمی کی طرح کہ جو حادثہ کا شکار ہو کر لاپتہ ہو گیا ہو
اس طرح سے اپنے منہ میاں مٹھو بننا ایک طرح کا دماغی مرض سا ہو گیا ہے
جب کوئی اس مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کا یہ احساس مٹ جاتا ہے کہ وہ

جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر سننے والے یقین کریں گے کہ نہیں۔ اور جب وہ اس درجہ پر پہونچ جاتا ہے تو اس کو اس کی بھی پرواہ نہیں رہتی کہ کوئی اس کو سچا سمجھے کہ جھوٹا وہ ایک ساں اپنی بک بک سے سب کو بور کیئے جاتا ہے اور جب لوگ اس بات کاٹ کر اسے عقل سکھانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی مجبوری اور اپنے حواس کی معذوری کیوجہ سے اس کی پرواہ بھی نہیں کرتا بے جھجھک اور بلا پس وپیش اپنی بکواس جاری رکھتا ہے۔ اس کو یہ احساس بالکل نہیں ہوتا کہ اس کی باتوں کی کھلّی اڑائی جارہی ہے اس پر پھبتیاں کسی جارہی ہیں اس کو نکّو بنایا جارہا ہے اسکی بات کاٹی جارہی ہے۔ وہ تو اپنے آپ میں مگن۔ اپنے منہ میاں مٹھو بنتا ہے۔

آج کل کی دنیا میں اپنی تعریف آپ کرنے کا ایک نیا ڈھنگ چل پڑا ہے جس کو اشتہار بازی کہا جاتا ہے اور یہ ایک مانا ہوا فن بن چکا ہے اس کی مدد سے صنعت کار اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو اور تاجر اپنے اسٹاک کو بڑی آسانی سے دنیا کے کونہ کونہ میں پہونچا دیتے ہیں۔ اشتہار بازی کا کمال تو یہی ہے کہ چاہے چیزیں کتنی ہی گھٹیا اور ردّی کیوں نہ ہوں اس کی خوبیاں اور عمدگی سی گنائی جاتی ہیں کہ لوگ اس سے متاثر ہو کر ان چیزوں کے استعمال کے عادی ہو جاتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اکثر جنگیں اسی پروپیگنڈے کے سہارے جیتی گئی ہیں۔ انتخابات اور چناؤ میں بھی اسی فن کا بڑا دخل رہتا ہے اور اس کا ہوشیاری سے استعمال پانسہ پلٹ دیتا ہے۔

ایک صاحب اپنا مکان فروخت کرنا چاہتے تھے کہ اس میں ان کو ہر طرح

کی تکلیف تھی جس سے وہ خود اور ان کے بال بچے سب ہی تنگ آچکے تھے جائداد فروخت کرنے والے ایک ایجنٹ نے ان کے مکان کا اشتہار دیا تو یہ پڑھکر بے حد متاثر ہوئے اور ایجنٹ سے کہا کہ اب ہم نے ارادہ بدل دیا ہے تم نے اس اشتہار میں ہمارے مکان کی ایسی ایسی خوبیاں گنائی ہیں کہ جس سے ہم خود ناواقف تھے اب تو ہم اسی میں رہیں گے اور اس کو کسی قیمت پر بھی فروخت نہیں کرینگے۔

یہ ہے اشتہار بازی کا کمال۔ مگر اشتہار بازی اور اپنے منہ میاں مٹھو بننا کچھ جدا جدا حیثیت رکھتے ہیں اول الذکر فن ہے تو موخر الذکر ایک علّت۔

خود برداشتہ مزاح

شوخ بیانی، طنز و استہزاء، رمز، ایجاز، ہزل، ریختی، مخول، ٹھٹھا، مضحکات، سخن چینی، تفنن، ہجو، ضلع جگت اس طرح کی کئی اصناف و اقسام ہیں جن میں بالعموم کسی اور کو نشانۂ ملامت بنا کر ہم خوش ہو لیتے ہیں۔ اور دوسروں کو ہنساتے ہیں کسی کو گندے پانی میں شرابور ہوتے ہوئے یا کیلے کے چھلکے پر سے پھسلتے ہوئے دیکھ کر بے ساختہ ہنس پڑتے ہیں۔ کسی کے ہکلانے پر کسی کی نادانستہ غلطی پر نقالی پر ہنس لینا ہمارا روزمرّہ کا معمول ہے اور ہم کسی بھی مذاق سے بخوشی لطف اندوز ہوتے ہیں جبکہ اس کا معمول یا نشانہ کوئی اور ہو برخلاف اس کے جب کسی کے مذاق سے ہماری انا کو دھکا لگتا ہے یا ہماری خود کی کسی کمزوری پر کوئی لاف لگاتا ہے۔ تو ہم کو بیحد ناگوار گذرتا ہے۔ یہ اس لئے بھی ہوتا ہے کہ ہم سب اپنی کمزوریوں اور خامیوں سے بخوبی واقف رہتے ہیں، گو ان کا اقرار نہیں کرتے اسی لئے دوسروں کے انہی عیبوں پر ہنس کر خود کے احساسِ کمتری کو مٹانا چاہتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا فرار ہے بقول بہادر شاہ ظفر

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

ہم بہت زیادہ خوش اس وقت ہوتے ہیں کہ جب کوئی اور اپنے آپ کو نشانۂ ملامت یا نشانۂ ہدف بناکر ہنستا بھی اور ہم کو ہنسنے پر اکساتا ہے۔ ایسے میں ہم اپنے کو کسی اور کی زد سے محفوظ پاکر طمانیت اور خوشی بھی محسوس کرتے ہیں۔ اس قسم کی ظرافت جو خود بر داشتہ ہو سب سے زیادہ بلند پایہ، صاف اور ستھری ہوتی ہے اور دماغی صحت کا بیّن ثبوت ہوتی ہے اور یہی دماغی صحت ایک قسم کا تحفظ اور گارنٹی ہے صحت جسمانی کے لئے۔ جو استاد اپنی کلاس میں اپنے آپ پر ہنس سکتے ہیں ان کے روابط اپنے شاگردوں سے بڑے خوشگوار اور عزت افزا ہوتے ہیں ہمیں یاد ہے کہ ہم لوگوں نے کالج میں ایک فٹ بال ٹیم طلباء کی بنائی اور دوسری اپنے اساتذہ کی۔ پروفیسروں کی اس ٹیم کے لئے ہم نے انگریزی کے نامور پروفیسر و برا بھدر ڈو کا نام بطور کپتان لکھا۔ یہ جسمانی اعتبار سے نہایت ہی سخنی لاغر اور دبلے پتلے تھے۔ جب نوٹس ان کے پاس پہونچا تو انھوں نے اپنے نام کے آگے صرف یہ لکھا۔ کیا آپ لوگ ایسے پروفیسروں کو بھی مستثنیٰ نہیں کریں گے کہ جو فٹ بال سے بھی مختصر ہیں۔ کتنا زبردست طنز ہے یہ اپنے آپ پر کس قدر ہنسے ہیں ہم اس مذاق پر۔ جس آدمی میں مزاح کی حس ہو وہی اس قسم کا وار کر سکتا ہے خود پر۔

حضرت غالبؔ نے اس طرح کی چوٹیں اپنے آپ پر خوب کی ہیں۔ ؎

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

اکبرالہ آبادی نے بھی اس طرح کی خنجر زنی کی ہے کہ خود کو لہولہان کر دیا۔ ؎

بھیا رنگ یہی ہے اچھا
ہم بھی کالے یار بھی کالا!
عاشقی کا ہو برا اس نے بگاڑے سارے کام
ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی اے ہو گئے

مارک ٹوین نے مزاح کی اس صنف کو روشنی دینے والی بجلی سے تعبیر کیا ہے۔ اور دوسروں کو ایذا پہنچانے والے مذاق کو آسمانی بجلی کہ جو جلا کر بھسم کر دیتی ہے باب ہوپ اس قسم کی ظرافت کے لئے مشہور ہیں کہ جس کو AD LIB کہا جاتا ہے جو مذاق فی البدیہہ اپنے آپ پر چسپاں کر دیا جاتا ہے اکثر اس میں لطیف قسم کی دیوانگی شریک ہوتی ہے اس لئے اس کو MAD LIB بھی کہا جاتا ہے باب ہوپ سوچ سمجھ کر ایسی باتیں اپنے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ جو ان کی کم ہمتی، بزدلی یا ناسمجھی کی دلیل قرار دی جا سکتی ہیں۔ "مکہ" بازی کے تعلق سے انھوں نے ٹیلی ویژن پر بتایا کہ وہ کبھی اس میں دخل رکھتے تھے۔ لیکن وہ ہمیشہ دوسروں کے سہارے ہی اکھاڑے کے اندر جاتے اور باہر آتے رہے۔

اس قسم کی باتوں سے دوسرے بے حد حظ اٹھاتے ہیں اور خوب ہنستے ہیں لیکن ان باتوں کے کہنے کے لئے نہ صرف دل گروہ چاہیئے بلکہ قوت ارادی بھی ہم اپنے آپ پر ہنستے ہیں تو ساری دنیا ہمارے ساتھ ہنستی ہے اور جب ہم دوسروں پر ہنستے ہیں تو ہمارا ساتھ دینے کی جرأت نہیں رکھتے۔ جو اپنی بڑائی ہانکتا ہے، اپنی فتوحات کی داستاں سناتا ہے۔ جو اپنے کارہائے نمایاں سنا کر مرعوب کرنا چاہتا ہے تعلی کرتا ہے، ڈینگ

مارتا ہے اس کو کوئی بھی برداشت نہیں کرتا۔ بلکہ اس کو بور کا خطاب دیا جاتا ہے مگر باب ہوپ کی طرح اپنی کمزوریوں کو اچھال کر تماشہ دیکھئے۔ لوگ آپ سے پیار کرنے لگتے ہیں، مشفقانہ مربیانہ اور احساس برتری سے بھرپور پیار۔ اس میں ان کی انا، کو ایک بڑا درجہ ملتا ہے۔

ہمیں ایک موقعہ پر صدارت کا اعزاز بخشا گیا اور بہت سوں نے تعریف و توصیف کے پل باندھ دیئے خطبۂ صدارت کا وقت آیا تو ہم نے وہ قصّہ دہرایا کہ سمندر میں ڈبتے ہوئے ایک لڑکے کو دیکھ کر کنارے پر شور مچا۔ بچاؤ بچاؤ لڑکا ڈوب رہا ہے۔ کوئی اس کو بچاؤ" لیکن کسی نے بھی پانی میں کودنے کی ہمت نہ کی۔ اتنے میں ایک صاحب دکھائی پڑے کہ جو سمندر میں لڑکے کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بڑی مشکلوں سے انھوں نے اس کو کنارے پر کھینچا۔ لوگوں نے بڑی واہ واہ کی۔ ان کی ہمت کی داد دی۔ یہ کچھ سنبھلے تو بولے" وہ تو سب ٹھیک ہے کہ میرے ہاتھوں لڑکے کی جان بچ گئی ہے۔ پر کوئی یہ تو بتاؤ کہ سمندر میں مجھے ڈھکیلا کس نے؟"

جولیٹ پو امریکہ کی گرل اسکاؤٹ (گرل گائیڈ) تحریک کی بانی مبانی کو ثقلِ سماعت کی کمزوری تھی مگر وہ اپنے اس عیب سے خود برداشتہ ظرافت پیدا کرتی تھیں۔ ایک بار خود انھوں نے اپنے تعلق سے اس قصہ کو دہرایا کہ کسی جلسہ کی وہ صدارت کر رہی تھیں اور انھوں نے محسوس کیا کہ مقرر کو خاطر خواہ داد نہیں مل رہی تھی، اور لوگ واہ واہ کر رہے تھے نہ تالیاں بجا رہے تھے۔ اپنی کمزوری کی وجہ سے یہ سن بھی نہ سکتی تھیں کہ مقرر کیا کہہ رہا ہے اس کے باد خود انھوں نے تقریر کے دوران خوب واہ واہ

کی۔ خود بیان کرتی ہیں کہ بعد میں انھیں پتہ چلا کہ مقرر ان کی تعریف کر رہا تھا۔

لائیڈ جارج کہتے ہیں کہ انھیں کسی نے بتایا کہ دریا میں ڈوبتے ہوئے آدمی کی جان بچانے کے لئے ایک صاحب کود پڑے اور جب ڈوبنے والے کے قریب پہونچے تو پہلے اس کو پانی سے اوپر کھینچ کر اس کی صورت بغور دیکھی اور اطمینانِ خاطر کے بعد اس کو گھسیٹ کر باہر نکالا۔ بعد میں لوگوں نے اس شخص سے پوچھا کہ ڈوب مرنے والے کی جان بچانے سے پہلے اس کی صورت دیکھنا کیا ضروری تھا۔؟

لائیڈ جارج بڑے مزہ سے اس قصہ کا منتہی سناتے ہیں کہ اس شخص نے بتایا کہ وہ اس امر کا جلد از جلد اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ کہ جس کی جان بچا رہا ہے وہ لائیڈ جارج تو نہیں:

اس قسم کی اعلیٰ اور پاک ظرافت مہاتما گاندھی کی زندگی میں بھی بہت ملتی ہے۔ ان کی خوش مذاقی مسلمہ ہے اور ان کی صحت مند طویل عمری کا راز بھی یہی۔ کہ وہ ہر حال میں ہشاش بشاش رہتے اور ان کی ہر بات میں خوش مزاجی کی چاشنی ضرور شریک رہتی۔ اپنے آپ پر فقرے کسنے سے بھی وہ باز نہ آتے۔ ان کے چار لڑکے تھے۔ سب سے بڑے صاحبزادے گاندھی جی کے مزاج اور ان کی عظمت کے اونچے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ کسی نے پوچھا" آپ کی اتنی عظیم الشان ہستی ہے کہ آپ کے قریب آنے والے اجنبی بھی آپ کے کردار کے زیر اثر آجاتے ہیں اور اپنی کمزوریوں کو دھو ڈالتے ہیں۔ مگر یہ آپ کے صاحبزادے ایسے کیوں نکلے؟ گاندھی جی نے زیر لب تبسم کرتے کہا۔ میں جب جیسا تھا اس زمانہ کی میری اولاد بھی ظاہر ہے کہ ویسی ہی ہوگی

کبھی کبھار خاکساری اور انکساری کے سچے جذبات بھی اپنے آپ پر بھرپور وار کر کے اوروں کو فضیلت دیتے ہیں اور دوسروں کو متبسّم ہونے کا موقع عطا کرتے ہیں رابرٹ منٹگمری جنگ عظیم میں ہائی کمانڈ تھے۔ جو، ای، براؤن مشہور فلم اسٹار ان کے سیکٹر میں آئے تو انہوں نے خواہش کی کہ ان کے ساتھ تصویر کھینچی جائے۔ جو۔ ای براؤن نے بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ اتنے بڑے کمانڈر ان چیف کے ساتھ ان کی تصویر آئے گی۔ مگر منٹگمری نے کہا "آج مجھے بڑی مسرت ہو رہی ہے۔ میں اپنے بچوں کی ایک دیرینہ خواہش پوری کر رہا ہوں کہ ایک مشہور عالم ہستی کے ساتھ اپنی تصویر کھینچوا کر انہیں بھیج سکوں گا۔" اوروں کی نظر میں اپنے آپ کو بعید از قیاس طریقہ سے لاعلم اور کمزور کر کے بھی مزاح کی رگ کو بھڑکایا جاتا ہے۔

"مارک ٹوین نے یوں ہی پوچھا" کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ میں کیوں ہندسا گر کی طرح ہوں؟ بہت سارے لوگوں نے مختلف وجوہ بتائے اور قیاس آرائیاں پیش کیں۔ مگر ایک بھی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ بالآخر مارک ٹوین سے ہی وضاحت کرنے کو کہا گیا۔ انھوں نے جواب دیا "میں خود نہیں جانتا جبھی تو آپ سے پوچھتا تھا۔"

ٹینس کے ایک بہت پرانے اور نامور کھلاڑی نوجوان لڑکوں کو ٹینس کھیلتے دیکھ رہے تھے اور جب انھوں نے محسوس کیا کہ وہ گیند کی سروس میں بہت ہی کمزور ہیں تو یہ جوش و خروش میدان میں کود پڑے اور کہا کہ "ہم سروس کر کے بتاتے ہیں۔ گیند اور بلا ہاتھ میں لے کر ٹینس کورٹ پر بہت ہاتھ چلائے لیکن ہر بار ان کی گیند غلط گرتی رہی۔ جب یہ بہت ہی تھک گئے اور ایک بار بھی سیدھی گیند نہ لگا سکے تو

ہنس کر کہا "تو دیکھا تم لوگوں نے کہ غلط سلط سروس کس طرح کی جاتی ہے۔ اب تم احتیاطاً کے ساتھ سیدھی سروس کرنا۔"

کبھی کبھی لوگ واقعات اور حالات سے فائدہ اٹھانیکی خاطر بظاہر اپنے آپ کو موردِ لعن وطعن بناتے ہیں لیکن اس کے پیچھے زبردست مزاح چھپا ہوتا ہے جو ستم ظریفی کا مظہر ہوتا ہے۔

ایک نیتا نے بتایا مجھے اپنی پارٹی کے الیکشن کے وقت جب ووٹ لینا ہوتا ہے تو میں ٹیکسیوں میں خوب گھومتا پھرتا ہوں۔ اور ہر ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ کے علاوہ خوب بخشش دیتا ہوں۔ اور تاکید کرتا ہوں کہ میری پارٹی کو ضرور ووٹ دینا۔

ان کے مخالف نے کہا جی ہاں میں بھی ایسے ہی ٹیکسیوں میں گھومتا ہوں اور کرایہ کے علاوہ کچھ بھی ٹپ نہیں دیتا۔ اور تاکید کرتا ہوں کہ وہ آپ کی پارٹی کو ووٹ دے۔"

اب یہ امر واقعہ ہے کہ اپنے تعلق سے کچھ ایسی باتیں کرنا بھی کارگر ہوتا ہے جس میں اپنی مذمت ہو اور دوسروں کی سراہنا۔ ایک بار اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے ہم نے اس قسم کے خود برداشتہ طنز کے وار کئے۔

میری تقریر سے پہلے آپ نے تالیاں بجائیں وہ آپ کی نیک نیتی کی دلیل تھیں۔ دورانِ تقریر میں جو تالیاں بجائی گئیں وہ اس کا اظہار تھا کہ آپ کو مجھ سے اچھی تقریر کی امید وابستہ ہے اور اب جو اختتام پر آپ واہ واہ کر رہے ہیں وہ تو محض شکر گذاری کا جذبہ ہے کہ آپ کے بور ہونے سے پہلے تقریر ختم کر رہا ہوں۔

کسی نے ایک بار ہم سے پوچھا "آپ اکثر تقریریں کرتے ہیں تو کیا آپ ہمیشہ مختلف موضوعات پر بولتے ہیں۔؟ ہم نے کہا جی نہیں۔ میں تو وہی ایک گھسی پٹی تقریر ہر جگہ جھاڑ دیتا ہوں۔" سوال کرنے والے نے حیرت سے دریافت کیا "اگر وہی حاضرین پھر سے جمع ہوں تو آپ کیا کریں گے۔؟"

ہم نے بتایا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جو ایک بار ہمیں سن لیتا ہے وہ پھر کیوں آنے لگا۔

برنارڈ شا سے ایک بہت ہی حسین رقاصہ نے کہا "میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں کہ اس سنجوگ سے جو اولاد ہوگی وہ نہ صرف میری طرح خوبصورت ہوگی بلکہ آپ کی طرح ذہین اور صاحب فہم و ذکا۔ ہوگی۔

برنارڈ شا نے اپنی بدشکلی پر خود ہی وار کرتے ہوئے کہا اور شکل و صورت میری طرح اور عقل و فراست میں آپ کی طرح ہوئی تو۔؟

ہمارے نیتا نرنجن بابو خود بیان کرتے ہیں کہ انہیں ریڈیو اسٹیشن اپنی تقریر نشر کرنے جانا تھا۔ ایک ٹیکسی کو روکا تو ڈرائیور نے کہا میں گھر جا رہا ہوں۔ نرنجن بابو کی ریڈیو پر تقریر سننا ہے، نرنجن بابو کو بڑا فخر محسوس ہوا کہ ٹیکسی ڈرائیور تک ان کی تقریر سننے کا اس قدر مشتاق ہے پھر بھی انہیں جلدی تھی کرایہ کے علاوہ پانچ روپے بخشش کا وعدہ کیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نہ صرف فی الفور راضی ہو گیا بلکہ کہنے لگا "چلئے صاحب چلئے نرنجن بابو کو گولی ماریئے۔ اس کو سن کر کیا لینا دینا ہے مجھے۔"

دنگل میں کشتیاں ہو رہی تھیں ایک پہلوان اپنے حریف سے بہت گھبرائے تھے

ان کے دوستوں نے کہا گھبراؤ نہیں یار بس تم دل ہی دل میں دہراتے رہو کہ میں یہ کشتی ضرور جیت جاؤں گا۔ اور بس تم ضرور جیت جاؤ گے۔

پہلوان نے تلملا کر کہا "جی یہ بات کچھ کارگر نہیں لگتی۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کتنا جھوٹا ہوں۔"

یہ تو ہوئیں روزمرہ کی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والی حکایتیں۔ لیکن ہمارے استاد شعرائے باکمال نے نہ صرف مزاحیہ انداز میں بلکہ سنجیدہ کلام میں بھی اپنے آپ پر طرح طرح سے طنز و مزاح کے گہرے وار کیے ہیں۔"

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

اکثر شعرا نے زندگی کی تلخیوں، غم زمانہ غم روزگار اور غم یار کے باوجود فطری خوش مزاجی کا سہارا لے کر یاسیت سے فرار کی خاطر خود کو طنز و استہزا کا شکار بنایا ہے زمانہ کو برا بھلا کہا ہے قدرت سے ٹکر لی ہے لیکن کسی اور کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا۔

غم جو کھاتا ہوں تو مجھ کو کھائے جاتا ہے یہ غم
کھاؤں گا پھر کیا میں دنیا بھر کا غم کھانے کے بعد

نئے رشتے نئے ناطے

کچھ رشتے قدرتی ہوتے ہیں کچھ قانونی۔ ماں باپ بھائی بہن بیٹا بیٹی۔ یہ تو قدرتی رشتے ہوئے جن سے ہر کوئی بندھا ہوتا ہے ان کے علاوہ جو قانونی ناطے ہوتے ہیں وہ خودساختہ اور اپنی مرضی کے بندھن ہوتے ہیں جیسے شادی کے بعد ساس سسر داماد۔ بہو۔ سالہ۔ سالی۔ ہم زلف۔ سمدھی وغیرہ یہ رشتے بندھن کے ساتھ ہوتے ہیں۔ جہاں شادی بیاہ کا بندھن ٹوٹا یہ سب اجنبی ہو گئے۔ اسی لئے ان کو انگریزی میں INL AWS LANDS کہا جاتا ہے کہ محض قانون کی جکڑ بندی ہوتی ہے۔ مگر قانونی رشتہ ٹوٹنے پر یہ OAT LAWS نہیں کہلاتے۔

ان دونوں رشتوں سے ہٹ کر آج کل کے معاشی نظام نے ایک نیا رشتہ بھی قائم کیا ہے۔ اس لئے کہ سرکاری غیر سرکاری نظام معیشت میں درجہ بندی کا ہونا ناگزیر ہے اسی درجہ بندی کی وجہ سے افسر اور ماتحت کے ناطے رشتے قائم ہوتے جاتے ہیں جن سے کوئی مفر نہیں۔ ان رشتوں کو قائم رکھنے کے لئے دونوں کو بڑی کٹھنائیاں برداشت کرنا ہوتا ہے کو افسر اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے خواہ مخواہ سنجیدہ بننا پڑتا ہی رعب جمانا پڑتا ہے۔ اور اپنی عظمت کی برقراری کے لئے لاکھ جھنجھٹ اٹھانے

پڑتے ہیں۔ اسی طرح ماتحت کو فرماں بردار اور وقت کا پابند، اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی بہمہ تن انجام دہی کارکردگی کا اور بجا آوری ضروری سمجھتے ہیں اگر یہ بات یہیں تک رہتی تو سب کچھ ٹھیک تھا لیکن ماتحت کو خوش رکھنے کے لئے افسروں پر لازم آتا ہے کہ کاروبار کی جگہ ساری آسائشیں مہیا کریں گے ان کی فلاح و بہبود کے کام چالو کریں مہنگائی بھتہ ۔ پراویڈنٹ فنڈ ۔ بونس ۔ کام کی آسودگی اور سہولتوں کا انتظام بھی ضروری ہوتا ہے۔

آج کل تو ہر طرف یہی رشتے ناطے زیادہ اہم نظر آتے ہیں کسی زمانہ میں بیشک ماں باپ اور بزرگوں کی عزت ان کا احترام اور سب باتوں سے زیادہ ہی اہمیت رکھتے تھے۔ اسی طرح میاں بیوی کا آپس میں پیار، بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تعلیم و تربیت پر سارا دھیان ہوتا تھا۔ لیکن فی زمانہ کاروباری مصروفیتوں کی وجہ سے ان باتوں کے لئے کسی کے پاس وقت ہی نہیں۔ صبح اٹھو تو دفتر۔ اور اپنے کاروبار کی فکر دن بھر اسی الجھن میں گذر جاتا ہے۔ شام کو گھر جانے کا وقت ہوتا ہے تو ڈھیروں کام ادھورا پڑا ہوتا ہے اس وقت اس کام کو گھر ساتھ لے جانے کے سوا چارۂ کار نہیں ہوتا۔ یہ گھر کی ساری فضاء کو خراب کرنے کا آسان ترین ذریعہ ہے۔ اب تو افسر اور ماتحت کے رشتہ کی اتنی زیادہ اہمیت ہوگئی ہے کہ خدا اور بندہ کا رشتہ بھی لوگ بھولتے جارہے ہیں۔ ان کو وقت ہی نہیں کہ خدا کو یاد کریں یا اس کے حضور میں کچھ وقت بتائیں۔

دفتر چاہے سرکاری ہوں کہ غیر سرکاری، مرکزی حکومت کا سب سے بڑا

دفتر ہو کہ صوبجاتی سرکار کا۔ ضلع پریشد ہو کہ گرام پنچایت۔ بڑی سے بڑی لمیٹڈ کمپنی ہو کہ معمولی سا صنعتی یا بیوپاری کاروبار ہو۔ درجہ بندی ہر جگہ ہے کہیں اچھے خوش نما طرح دار نام ہیں تو کہیں معمولی سے لیکن کام کرنے والے وہی انسان ہیں کہ جن کی سوجھ بوجھ کا دار و مدار اسی پر ہے کہ آج کا دن ٹل جائے کل کا کل دیکھا جائے گا۔ چاہے وہ پنڈت جی ہوں کہ شیخ صاحب۔ کلکرنی ہوں کہ مرزا جی۔ ڈیسوزا ہوں کہ نرنجن سنگھ۔ سکینہ ہوں کہ سری واستو۔ سب ہی تو اسی خاک پاک کے بنے ہوئے پتلے ہیں۔

خان صاحب نے اپنے افسر سے ۳۶ گھنٹہ کی چھٹی مانگی جو فی الفور منظور ہو گئی کہ ڈیڑھ دن کی تو بات ہے۔ لیکن یہ پورے سات دن غائب رہے اور آٹھویں دن حاضر ہوئے اور جب ان کا اس خصوص میں جواب طلب کیا گیا تو کو تشریح توضیح اور [illegible]رلال صاف لکھے سات گھنٹے روز دفتر کے اس میں سے ایک گھنٹہ لنچ کا۔ چھ گھنٹے روز کے چھ دن کل ۳۶ گھنٹے ہوئے ساتواں دن اتوار اس طرح پر آٹھویں دن کی حاضری حساب سے صحیح اور درست۔

ویسے یہ ہمیشہ دیر سے دفتر پہونچتے ان سے ایک دن کہا گیا کہ ٹھیک دس بجے دفتر میں رہنا چاہیئے۔ یہ الٹ کر پوچھ بیٹھے: کیوں کیا ہوتا ہے دس بجے؟ ان کو فی الحقیقت شکایت یہ ہے کہ جب کبھی یہ دیر سے آفس آتے ہیں تو ان کے افسر بھی ان کے ساتھ ہی آتے ہوئے ملتے ہیں اور پھر بھی ان کی دیر حاضری زیر بحث آتی ہے۔ ان سے دو چار بار پوچھ تاچھ کی گئی کہ جب کبھی ان کے افسر آتے ہیں تو انہیں کبھی کام میں

مصروف نہیں پایا گیا تو یہ صاف صاف بولے کہ اس میں ان کا کیا قصور، سب ہی افسر ایسے جوتے پہنتے ہیں کہ جن سے چلنے میں کوئی آواز ہی نہیں ہوتی اور قدموں کی چاپ بھی سنائی نہیں دیتی ورنہ وہ ضرور کام میں جُت جاتے اور کسی کو شکایت نہ ہوتی کہ وہ مصروف بہ کار نہ تھے۔

یہ اپنی ذاتی کاہلی اور کام سے عدم دلچسپی کے باوجود ہر ایک سے یہی کہتے ہیں کہ ان کی فرم میں ترقی کے بے انتہا مواقع ہیں اور پھر اس بات کو اس طرح پر سمجھاتے ہیں کہ وہ سب سے کم درجہ پر مامور ہیں لہٰذا ان کے اوپر بہت سارے درجے اور مرتبے ہیں اور اسی حساب سے ترقی کے لاتعداد موقعے۔

یہ اپنے دفتر میں بیکار اور بے مصرف گھومتے پھرتے ہیں کسی باہر والے نے ان کو روک کر پوچھا کہ اس دفتر میں ذمہ دار افسر کون ہے؟ یہ بلا جھجک بولے "جملہ خرابیوں کا ذمہ دار تو میں ہی ٹھہرایا گیا ہوں۔"

یوں تو یہ کوئی کام کرتے ہی نہیں لیکن ایک بار انہیں کچھ کاغذات ٹائپ کرنے دیئے گئے، جس کو انھوں نے بڑی محنت سے ٹائپ کیا اور اپنے افسر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ افسر نے کچھ ہی حصہ پڑھ کر پوچھا۔ ارے اس میں تو ٹائپ کی اتنی ساری غلطیاں ہیں۔ آپ نے ٹائپ کر کے پڑھا تک نہیں یہ بولے: باس میں پڑھتا کیسے ان سب پر "راز"، لکھا ہے اور میں کسی کے راز کے کاغذات کیسے پڑھ سکتا ہوں۔"

انھوں نے بڑی ہمت سے کام لیا اور اپنے افسر سے جھجکتے جھجکتے کہا: "میں آپ کے دفتر میں ۲۵ سال سے کام کر رہا ہوں اور اس سے قبل آپ سے کبھی نہیں کہا۔ مگر

اب تو میری تنخواہ بڑھا دیجئے۔ ان کے حاکم نے ان کو بتایا: "ہاں بے شک تم نے کبھی اضافہ تنخواہ کی درخواست نہیں کی۔ اس لئے تو ۲۵ سال سے یہاں پر ہو۔"

۲۵ سالہ مدت کا سہارا لیتے ہوئے انھوں نے کہا: "میں آپ کے دفتر کا دیرینہ ملازم ہوں اور میرے ۲۵ سال کے تجربے کے باوجود آپ نے دوسرے جونیئر کو ترقی کا مستحق گردانا آخر میرے ۲۵ سال کے تجربے کا آپ کو کوئی لحاظ نہیں۔ ان کے حاکم نے بتایا۔ آپ کا تجربہ تو کل ایک سال کا ہے جس کو ۲۵ سال سے دہرا رہے ہو، آگے کہاں بڑھے ہو۔"؟

چونکہ یہ اپنے دفتر کے سب سے نچلے زینے پر ہی براجمان ہیں۔ ان کے دوستوں نے سوال کیا تمہیں ترقی کیوں نہیں ملتی؟ کیا ٹھیک سے کام نہیں کرتے ہو؟ ان کا جواب صاف تھا: "کام تو بڑی متعدی اور جاں فشانی سے کرتا ہوں"۔

دوستوں نے پوچھا: "پھر کیا بات ہے؟"

یہ بولے: "جی میں ذرا سست واقع ہوا ہوں" اس جواب پر ظاہر ہے کہ پوچھا گیا: "سست؟ ابھی تو تم نے کہا کہ بہت مستعد اور کارگذار ہو۔"

انہوں نے کہا: "جی بات یہ ہے کہ میں ہنسنے میں سست ہوں۔" لازمی طور پر سوال اٹھا:

ہنسنے سے دفتر کے کام کو کیا تعلق؟" ان کی وضاحت بڑی دلچسپ ہے:

"تعلق ایسے ہے کہ ہمارے افسر کے کہے ہوئے لطیفوں پر ذرا دیر سے ہنستا ہوں اور انکی ہر بات پر ہنسنا ہمارے فرائض میں داخل ہے۔"

کیوں نہیں کی؟ ان کا جواب بڑا دلچسپ تھا۔" دفتر والوں سے ایک آدھ بار غلطی ہو جائے تو کون پرواہ کرتا ہے مگر ان سے غلطی ہر بار ہو تو میں کیسے چپ رہ سکتا ہوں۔

انہیں کے دفتر میں کسی جائداد کے لئے امیدواروں کا انٹرویو لیا جا رہا تھا۔ ایک امیدوار سے انہوں نے پوچھا" آپ کوئی خاص اہلیت جیسے شارٹ ہینڈ ٹائپنگ حساب دانی وغیرہ رکھتے ہیں"؟

امیدوار کے جی نہیں کہنے پر انہوں نے کہا

تب تو آپ کے لئے ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں اس لئے کہ کچھ بھی نہ جاننے والوں کو سفارش کی بنا پر رکھ لیا گیا ہے۔

اسی انٹرویو میں امیدواروں سے کچھ اور دلچسپ سوال و جواب ہوئے۔

سوال: کیا سگریٹ پیتے ہو؟

جواب: جی نہیں۔

سوال: شراب۔

جواب: بالکل نہیں۔

سوال: جوا کھیلتے ہو۔

جواب: کبھی نہیں۔

سوال: تب تو آپ میں کوئی برائی یا عیب نہیں؟

جواب: جی صرف ایک۔ میں جھوٹ بہت بولتا ہوں

ان کی کارکردگی سے افسر بالادست سخت نالاں ہیں۔ ان سے کئی بار کہا ہے کہ وہ ان کے اچھے کام پر مبارک باد دینا چاہتے ہیں اور ہر بار پوچھتے ہیں کہ بتاؤ تم مجھے اس کا کب موقع دو گے۔

ایک مرتبہ کسی انسپکٹنگ افسر نے ان سے دریافت کیا کہ وہ اس دفتر میں کب سے کام کر رہے ہیں انھوں نے بلا جھجک جواب دیا "جب سے مجھے نوٹس دیا گیا ہے کہ کام نہیں کروں گا تو علیحدہ کر دیا جاؤں گا۔" پھر ان سے استفسار کیا گیا کہ ان کے دفتر میں کتنے آدمی کام کرتے ہیں انہوں نے بتایا "صرف دس فی صد"۔

اسی انسپکشن کے دوران میں ان سے پوچھا گیا کہ اس دفتر میں ملازمت حاصل کرنے سے پہلے یہ کیا تھے؟ ان کا جواب بڑا دلچسپ تھا۔ "جی میں بالکل مطمئن اور قانع آدمی تھا۔"

ایک دن دفتر کی لفٹ میں حاکم اعلیٰ سے مڈبھیڑ ہو گئی تو اس نے ان سے سوال کیا "آج پھر دیر ہو گئی؟" یہ اس سوال کو بڑی خوبی سے نظر انداز کر کے فرماتے ہیں "جی ہاں آج مجھے بھی دیر ہو گئی۔" جیسے کہ ان کا حاکم ان سے خود اپنی دیر حاضری کے لئے معذرت خواہ تھا۔

ایک بار تنخواہ میں کسی الونس کے دس روپے کم ملے تو انہوں نے افسر متعلقہ سے اس کی شکایت کی۔ جب محاسب کو طلب کر کے پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ پچھلے ماہ ان کو دس روپے زیادہ ایصال ہو گئے تھے اس کو منہا کیا گیا ہے۔ افسر متعلقہ نے پوچھا "جب پچھلے مہینہ حساب سے سوا روپے ملے تھے تو انہوں نے شکایت

کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اس لئے کہ یہ اپنی تنخواہ اس مناسبت سے ہرگز مقرر نہیں کرنا چاہتے۔

اب تو یہ اپنی گری ہوئی حیثیت سے عاجز آ چکے ہیں ایک موقع پر ان کے باس نے ان سے استفسار کیا۔

کیا تم محنت اور مشقت سے کام نہیں کر سکتے۔ انہوں نے بڑا مزیدار جواب دیا۔ یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں مشقت سے کام نہیں کرتا مجھے تو اس کی بڑی عادت ہے کئی بار قیدِ مشقت بھگت چکا ہوں۔

ویسے تو ہر دفتر کا ماحول بڑا سنجیدہ اور روکھا پھیکا ہوتا ہے۔ اور بڑی حد تک ضبط و تنظیم کے معنیٰ ہی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ کبھی کوئی بھی کسی بات پر ہنسے نہیں قہقہہ لگانا تو بڑی بات ہے پھر بھی انسانی فطرت پر بہت زیادہ روک ٹوک ناممکن ہے کچھ نہ کچھ مواقع ایسے آ ہی جاتے ہیں کہ افسر اور ماتحت اپنے رشتے کو بھول کر ہنس پڑتے ہیں۔ ابھی ہم جن صاحب کا ذکر کر رہے تھے وہ ایک دن اپنے آفس کی میز پر سوتے پائے گئے۔ ان کے باس نے جگا کر پوچھا کیا بات ہے کچھ طبیعت تو خراب نہیں؟"

انہوں نے جھینپتے ہوئے کہا۔" جی نہیں میری طبیعت تو بالکل اچھی ہے۔ رات گھر پر سو نہیں سکا تھا اس لئے آنکھ جھپک گئی۔"

باس نے حیرت سے پوچھا: تو آپ رات گھر پر بھی سوتے ہیں؟ یہ اس لئے پوچھا گیا کہ دفتر میں سونے کی عادت کا سب کو پتہ تھا۔ اس استہزائیہ جملے پر سارا دفتر بے اختیار ہنس پڑا شاید اسی لئے انگریزی میں یہ کہاوت بہت مقبول ہے کہ بہت

ایک اور ملازمت ڈھونڈھنے والے سے اس کی دیانت داری ایمانداری اور سچائی کے متعلق سوال کیا گیا تو اسنے جواب دیا "میری نیک کرداری اور دیانتداری مسلم ہے میں جہاں پر کام کرتا تھا وہاں کے عہدہ داروں نے مجھ پر چار چھ بار چوری اور دغابازی کے الزام لگا کر پولس کے سپرد کیا لیکن عدم ثبوت کی بنا پر سارے مقدمے خارج ہو گئے۔ بتایئے اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت پیش کروں؟"

ایک اور امیدوار نے الٹ کر انھیں سے سوالات کیے "کیا آپ کی کمپنی بیماری کی رخصت کے دوران پوری تنخواہ علاج معالجہ کے اخراجات دے گی۔

جواب: ہاں وہ تو ضرور ملیں گے۔

سوال: میری زندگی کے بیمہ کے اقساط کمپنی ادا کرے گی؟

جواب: وہ تو خود آپ کو دینا ہوگا۔

سوال: چھٹی میں گھر جانے کے اخراجات اور وہاں کا خرچہ؟

جواب: یہ تو نہیں ملیں گے۔

امیدوار۔ مگر میری سابقہ نوکری میں تو یہ سب ملتا تھا۔

ان سے پوچھا گیا کہ پھر انہوں نے ایسی اچھی نوکری چھوڑی کیوں؟ ان کا جواب تھا کہ وہ کمپنی دیوالیہ ہو گئی۔

ان کو ایک دوسرے دفتر میں نوکری کا موقع مل رہا تھا۔ انہوں نے حاکم سے پوچھا کہ وہ انہیں کیا تنخواہ دے گا۔ اس نے کہا: میں تمہاری لیاقت صلاحیت قابلیت اور کارکردگی کے لحاظ سے تنخواہ مقرر کروں گا اس پر یہ بہت چونکے اور اس نوکری

سارے لوگ فائلوں پر سو جاتے ہیں یعنی فائلیں دبی پڑی رہتی ہیں ان پر کوئی کاروائی نہیں کی جاتی ۔اور لوگوں کی قسمتیں جاگتی نہیں ۔

یہی صاحب ایک بار کچھ نیند کی غنودگی میں تھے افسر نے ان سے کہا۔ دیکھو جی تم آفس میں سو نہیں سکتے ۔

انھوں نے جواب دیا۔ جی آپ بار بار ادھر چکر لگاتے رہیں گے تو میں کسی طرح بھی سو نہیں سکتا ۔

ایک بار بمبئی میں بہت بڑی کانفرنس تھی جس کے لیے بہت سارے عہدیدار اضلاع سے آئے ہوئے تھے ۔خیال تھا کہ ایک ہی دن کی بیٹھک ہوگی اور شام تک کانفرنس ختم ہو جائے گی ۔تو عہدیدار اپنے مستقر کو لوٹ جائیں گے ۔اسی لئے انہوں نے رات کے قیام کے لئے کہیں بندوبست نہیں کیا تھا ۔جب کانفرنس شام تک ختم نہیں ہوئی تو تصفیہ ہوا کہ دوسرے دن اس کو چالو رکھا جائے اب ان عہدیداروں کو پریشانی ہوئی کہ رات گذاری کا کیا ہوگا ۔ بمبئی میں جب تک پہلے سے پہلے اس کا انتظام نہ ہو۔ کسی ہوٹل میں بھی جگہ نہیں ملتی ۔ایک عہدیدار نے سب سے بڑے حاکم سے اس کی اجازت مانگی کہ کچھ لوگوں کو کہ جنھیں قیام کی دشواری تھی آفس ہی میں سونے کی اجازت دیدی جائے ۔حاکم اعلیٰ نے بڑی سختی سے کہا : میں اس کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا کہ عہدیدار رات کو بھی دفتر میں سو جائیں ۔

اِن کا مطلب صاف تھا کہ دن میں تو سوتے ہی ہو رات کو کیسے اس بات کو روا رکھا جائے ۔

ان کے دفتر کو اتفاقاً تین دن کی چھٹیاں تھیں ایک آدھ دن تو جیسے تیسے گذر گیا۔ اس کے بعد ان کا وقت ہی نہیں کٹتا تھا۔ بیماری میں دن بھی لمبا لمبا لگنے لگا۔ سونے کی کوشش بے سود ہو گئی بالآخر ایک میز انھوں نے ایسی جمائی کہ جیسے دفتر میں ہوتی ہے۔ اس پر بہت سے فائلیں ادھر ادھر سے جوڑ کر رکھ دیں کچھ قلم بغیر نب کے۔ گھسے ہوئے پنسل۔ بغیر سیاہی کی دوات۔ پن کشن جس میں زنگ بھری پنیں تھیں۔ جنتری۔ ڈسک ڈائری سب اسی انداز سے سجایا کہ جیسے ان کے آفس کی میز پر ہوا کرتا ہے۔ پھر چائے کی پیالی رکھی اور ہاتھ میں قلم لے کر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں جماہیاں لینے لگے اور ان پر نیند کا غلبہ طاری ہو گیا۔ دفتری ماحول جو بن گیا تھا۔

ایک بار ان کی شکایت ہوئی کہ یہ اپنے ماتحت عملہ کے ساتھ درشت کلامی اور بد زبانی سے پیش آتے ہیں اکثر نو نامذیبا الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں ان کے افسر نے بلا کر ان سے پوچھا کیا شکایت صحیح ہے کہ آپ اس طرح کا ناروا سلوک کرتے ہیں اور کچھ گالی والی بھی بکتے ہیں؟ یہ بڑے طیش میں جھلا کر بولے "کون نامعقول ہے جو ایسی واہیات بکواس کرتا ہے میں نے تو کبھی کسی۔۔۔ کو گالی دی اور نہ کسی نسل حرام کو برا بھلا کہا۔ اسی رو میں انھوں نے کئی ایسی گالیاں دھرائیں کہ جن کو یہاں پر لکھا بھی نہیں جا سکتا۔

اہنوں نے فائل پر کچھ الٹی سیدھی تجاویز پڑھنے اور سمجھ میں نہ آنیوالے انداز میں لکھ کر ملاحظہ میں پیش کیا تو ان کے افسر نے اس پر کہا" یہ سب کیا بلا بتر ہے اور فائل واپس کر دی۔ انھوں نے وہ فائل اس نوٹ کے ساتھ پھر سے عہدہ دار

متعلقہ کی خدمت میں بھجوایا۔" جی یہ وہی ہے جس کے متعلق آپ نے مجھے حکم دیا تھا۔

ان کے دفتر کی ساری گھڑیاں غلط وقت بتا رہی تھیں کسی میں ۵ منٹ کم ہے۔ کسی میں ہے۔ کسی میں ہے بجکر ۳ منٹ ان سے پوچھا گیا کہ ایسا کیوں؟

یہ بولے "اگر سب ہی گھڑیاں یکساں اور صحیح وقت بتائیں تو پھر ایک ہی گھڑی کافی ہوتی۔

اسٹاف میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے وضاحت کی" آپ کی ذمہ داریاں کسی نوعیت کی ہوں کام چاہے جس طرح کا ہو آپ کی تنبیہہ کی جاتی ہے یا ڈانٹ پلائی جاتی ہے۔ ایک بات ضرور ہے کہ حرف آخر آپ ہی کی زبان پر ہوگا۔ جملہ کارکن اور اہلکاروں کے چہرہ اس بات پر کھل اٹھے اور مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ کچھ ڈرامائی آواز سے انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا" جی ہاں آپ کا حرف آخر ہوگا۔ جی درست ہے۔"

ایسی ہی اسٹاف میٹنگ میں اپنی فرم کی تعریف کرنے کے بعد انہوں نے سوال کیا۔ بتایئے تو ہم کو اپنی اس کمپنی کے لئے کیوں جان تک کی قربانی دے دینا چاہیئے، کسی نے پیچھے سے کہا" ہاں آپ بالکل درست کہتے ہیں ہم کو کیوں قربانی دینا چاہیئے۔؟"

افسر اور ماتحت کے رشتوں کی ایک اور خوبی بڑی دل چسپ ہے۔ افسر جب دفتر میں ہوتا ہے تو وہاں کا ماحول۔ دفتر والوں کی کارکردگی ان کا طور طریق الگ ہوتا

رشتوں

ہے اور جب وہ نہیں ہوتا ہی تو سب کے سب جداگانہ طریقہ پر کام کرتے ہوئے یا صحیح الفاظ میں کام نہیں کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں ۔ چنانچہ اہل معاملہ کا بیان ہے کہ وہ کسی دفتر میں اپنے کام سے گئے اور حاکم اعلیٰ سے ملنے کے لئے اس کے چپراسی کو اپنا کارڈ دیا ۔ یہ حاکم اس دن بڑے مصروف تھے ۔ لوگوں سے ملنا نہیں چاہتے تھے اس لئے انہوں نے کہہ رکھا تھا کہ کوئی بھی اہل غرض آئے تو کہہ دینا کہ صاحب دفتر میں نہیں ہیں ۔ ان کو بھی یہی ٹکا سا جواب دے دیا گیا ۔ لیکن یہ وہیں آفس کے سامنے ڈٹے رہے ۔ تھوڑی تھوڑی دیر سے صاحب کو کسی طرح پتہ چلتا کہ یہ ملاقات کے متمنی ہیں اور یہ کسی نہ طرح سے پھر کہلوا دیتے کہ صاحب نہیں ہیں ۔ دن بھر یہ سلسلہ چلتا رہا ۔ مگر ان صاحب نے یہ بات نہیں مانی حتیٰ کہ شام کو جب گھر جانے کا وقت ہوا تو حاکم اپنے کمرے سے نکلے اور ان سے پوچھا کہ جب صریحی طور پر ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ نہیں ہیں تو پھر انہوں نے مانا کیوں نہیں ۔ ان کا جواب بہت ہی سیدھا اور سادا تھا ۔ میں یہ بات کیسے مان جاتا کہ آپ نہیں ہیں جب کہ میں یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ دفتر کا سارا عملہ ہمہ تن کام میں مشغول تھا ۔ ایسا تو کبھی ہو نہیں سکتا کہ حاکم اعلےٰ دفتر میں موجود ہو اور دفتر کا عملہ اپنے کام میں مشغول و مصروف نہ رہے جہاں دفتر سے افسر غائب ہوا کہ سب کے سب کام دھام چھوڑ کر گپ شپ ، چائے کافی اور سگریٹ نوشی میں منہمک ہو جاتے ہیں ۔ ہر ایک اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ ایسا موقع ملنے پر اس سے فائدہ اٹھائے ۔

ہمارے ایک ڈاکٹر دوست بتاتے ہیں کہ وہ جب کبھی اپنے ایک خاص مریض ،

کو دیکھنے گئے تو انھوں نے گھر کے بچوں کو شور مچاتے اور مریض کی بیوی کو گلے شکوے کرتے پایا کہ مریض بالکل آرام نہیں کرتا۔ اس کی بیماری دور ہو گی تو کیسے؟ ڈاکٹر صاحب نے تجویز کیا کہ مریض اپنی چھٹی کٹا کر فوراً اپنے کام پر رجوع ہو جائے تاکہ دفتر کے پرسکون ماحول میں اس کو آرام تو ملے۔ اب یہ کون پوچھے کہ جب ان کی طبیعت ہی اچھی نہیں تو ان کے ذمہ کا کام کیسے پورا پڑے گا۔

ایک اور حاکم اپنے کسی ماتحت کی بیماری کے دوران اس کو ہسپتال میں دیکھنے گئے اور بڑا دلاسا دلایا کہ تم کچھ فکر نہ کرو جتنے دن ضروری سمجھو ہسپتال میں اور چھٹی پر رہو۔ تمہارے کام کے تعلق سے ہم ضرور کوئی دوسرا انتظام کریں گے۔ فی الحال تو ہم یہ معلوم کرنے کی جستجو میں لگے ہیں کہ آخر تم کیا کام کیا کیا کرتے تھے۔

اس بے چارے کی غیر موجودگی میں کوئی کام نہیں رُکا یعنی دوسرے الفاظ میں یہ کوئی کام ہی نہیں کرتے تھے کہ جو بند ہو گیا یا رک گیا ہو ویسے تو ہمارے ایک دوست ہیں جنھوں نے اپنی بیس سالہ سروس میں ایک بار بھی چھٹی نہیں لی۔ ان کی حجت یہ ہے کہ ان کے بغیر ان کے دفتر کے کاروبار نہیں چل سکتے اور یہ ایک دن کے لئے بھی جائیں گے تو سارا کام ٹھپ ہو جائے گا۔ اور دل ہی دل میں یہ بھی مانتے ہیں کہ اگر یہ چھٹی پر گئے اور دفتر کا سارا کام ان کے بغیر بھی ظاہر ہے کہ چلتا ہی رہا تو ان کا پول کھل جائے گا۔ کہ دفتر میں یہ کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے محض بھرم ہی بھرم ہے۔

افسر اور ماتحت کے رشتے کا تانا بانا کچھ اس طرح پر بنا ہوا ہوتا ہے کہ کبھی افسر زیردست نظر آتا ہے اور کبھی ماتحت افسر کے اوپر اس طرح حاوی ہوتا ہے

کہ اس کے بغیر افسر کی افسری دھری رہ جاتی ہے دونوں کو بھی اپنے رشتے کو بڑی احتیاط اور عمدگی سے بنا ہنا پڑتا ہے یہ رشتہ ہماری نظر میں تو قدرتی رشتے ناطے اور قانونی رشتے ناطے سے بھی زیادہ نازک اور ساتھ ہی ساتھ زیادہ مضبوط نظر آتا ہے اسی کے استحکام کے لئے پارکنسن نے ایک نظریہ پیش کیا ہے جو بہت صحیح ثابت ہوچکا ہے۔ کہ ہر افسر اپنے کام کو عمدہ سے عمدہ طریقے پر سرانجام ہوتا ہوا دیکھنے کے لئے اپنے تحت زیادہ سے زیادہ جائدادیں قائم کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ اگر وہ اپنے مفوضہ کام میں امداد کے لئے ایک نائب کا عہدہ بناتا ہے تو اس نائب کو دو مددگار چا اس نائب اور دو مددگاروں کے پھر کچھ منتظم اور ہیڈ کلرک چاہیئے۔ ان کے تحت کچھ کلرک اور کارکن۔ پھر ان کے نیچے کچھ دفتری کچھ حولدار کچھ چپراسی یہ پارکنسن لا بہت مقبول ہو چلا ہے اور اسی سے افسر اور ماتحت کے رشتے بڑھتے ہی جاتے ہیں یہاں کی منصوبہ بندی کسی بندی کے لئے نہیں بلکہ اور راستے کھولنے کے لئے کی جاتی ہے۔ اس طرح پر افسر ماتحت کے رشتے قائم و دائم ہو چکے ہیں۔

ان رشتوں سے چھٹکارا نوکری سے علیحدگی پر ہی ہوتا ہے۔ ایک بار ان پر شبہ تھا کہ انہوں نے بھاری تغلب و تصرف کئے ہیں اور ان کی کمپنی بغیر کسی شہرت کے ان کو علیحدہ کر دینا چاہتی تھی انہوں نے احتجاج کیا اور دلیل پیش کی۔ اب جبکہ میرا ذاتی مکان ہے موٹر ہے بیوی کے پاس زیورات ہیں آپ مجھے علیحدہ کر کے نقصان میں رہیں گے۔ نیا آنے والا پھر سے ان سب کا بار کمپنی پر ہی تو ڈالے گا۔ یہ جب ملازمت سے علیحدہ ہو گئے تو گھر پر نوکر کو ہدایت کی کہ بیروزگار کے

ہونے کی وجہ سے کفایت شعاری ضروری ہے اس لئے گھر میں گیہوں کے بجائے جواری کی روٹی بنے گی مچھلی مرغ گوشت بالکل نہ پکے۔ مہینہ بھر کے بعد نوکر سے حساب لیا تو ان کے لئے جوار کی روٹی دال اور معمولی سبزی پکی لیکن ساتھ ساتھ گیہوں اور گوشت بھی پکتا رہا۔ نوکر کو ڈانٹ کر باز پرس کی تو اس نے کہا "جی حضور آپ کی نوکری نہیں تھی مگر میری تو قائم ہے اس لئے آپ کے لئے جوار اور دال میرے لئے گیہوں اور گوشت۔"

یہ ہیں نئے رشتے نئے ناطے جو ہر طرح سے دوران ملازمت میں اٹوٹ ہوتے ہیں اور جن کو نباہنا فریقین کا فرض ہے۔

مانو نہ مانو

قدرت نے انسان کو بولنے سننے دیکھنے چکھنے سونگھنے اور محسوس کرنے کی جو حسیات عطا کی ہیں وہ بڑی عجیب و غریب ہیں۔ انسان چاہے تو ان سب سے یکساں اور ایک ساتھ استفادہ کر سکتا ہے۔ اور چاہے تو کسی دو ایک سے اور نہ چاہے تو کسی سے بھی نہیں۔

باغ کی رنگارنگی، پھولوں کی خوشبو پرندوں کا چہچہانا ان سب سے ایک ساتھ ہم لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اور کبھی ہماری توجہ صرف گل و گلزار اور لالہ زار پر ہی ہو تو شاید ہم بلبل اور دوسرے خوش الحان پرندوں کے گیت سننے سے قاصر بھی ہو سکتے ہیں، کہیں پر موسیقی کی دھنیں اتنی سرمست اور مدھر ہو سکتی ہیں کہ ہم موسیقار کی صورت دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کریں گے خواہ وہ کتنی ہی جاذب نظر اور دلکش ہو۔ اسی طرح ہم کسی کی چکنی چپڑی باتوں میں اس قدر محو ہو سکتے ہیں اور اتنے متاثر کہ ان کے در پردہ کوئی فریب ہو تو ہم اس کا مداوا بھی نہیں کر سکتے۔

بہت سی باتیں سنی ان سنی کر سکتے ہیں کچھ جان کر بھی انجان ہو سکتے ہیں۔ کبھی دیکھی ہوئی چیز کو نظر انداز کر سکتے ہیں کبھی کسی وقوع پذیر ہونے والے حادثے کو ہماری آنکھیں اور دماغ قبول نہیں کرتے۔ اسی طرح بہت سی باتیں جان بوجھ کر کی جاتی ہیں کہ سننے والا ان پر کان نہیں دھرتا۔ نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور کتنی ہی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ہم کہتے ہوئے بھی یہ جانتے ہیں کہ ہم بلا مطلب کہہ رہے ہیں۔ کوئی ہمیں اچانک نظر آتا ہے تو کہتے ہیں "ہم ابھی آپ کو یاد

ہی کر رہے تھے۔ آپ کی عمر بڑی ہے"۔ کہیں جا پہونچتے ہیں اور نیت ہوتی ہے کہ بہت دیر بیٹھیں گے پھر بھی کہتے ہیں "۔ ہم تو بس یوں ہی دو چار منٹ کے لیے آ گئے تھے"۔ کسی سے کہہ دیں گے "آپ کی عمر ۵۰ سال ہے؟ ہم تو کبھی یقین نہیں کریں گے"۔ یا کسی کی تعریف و توصیف سے پہلے کہیں گے کہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ کو خوشامد پسند نہیں لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ___ کسی کے گھر معمولی چیز دیکھ کر کہیں گے اوہو' ہم نے تو ایسی عمدہ چیز آج تک کہیں اور نہیں دیکھی۔

کسی کے ذاتی معاملہ میں دخل اندازی کرتے ہوئے کہیں گے ہمیں کوئی مشورہ تو نہیں دینا ہے مگر ہم تمہاری جگہ ہوتے تو ___ اور پھر صلاح و مشورہ کا ایک لمبا باب کھل جائیگا۔ جب دل میں یہ کھلبلی مچی ہو کہ سنیں تو سہی لوگ ہمارے متعلق کیا چہ میگوئیاں کر رہے ہیں ہم بڑے اطمینان سے کہیں گے "۔ لوگ ہمیں کچھ بھی کہیں ہم تو ذرہ برابر پرواہ کرتے ہیں اور نہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں"۔

کوئی ہم سے کچھ مانگتا ہے تو کہیں گے "۔ ارے تم نے کچھ دن پہلے کیوں نہیں مانگا ہم ضرور دے دیتے آج تو ہمارے پاس نہیں"۔ کسی محفل میں آپ جائیے یہ ضرور سننا پڑے گا "ہمارے آج کے مہمان خصوصی کسی تعارف کے محتاج نہیں" اور پھر جو لمبی لمبی تقریریں ہوں گی ان کے متعلق ۔ ہاں ہر تقریر اسی جملے سے شروع ہو گی کہ میں صرف دو چار لفظوں میں آپ پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اور پھر وہ دو چار لفظ ایک لامتناہی سلسلہ ہونگے لفظوں کا ہی نہیں بلکہ جملوں کا۔ اسی طرح ہر مقرر اپنی تقریر کی طوالت کا احساس رکھتے ہوئے کہے گا "۔ تو اب میں آخر میں صرف اتنا کہوں گا ۔ اور وہ آخر کبھی کبھی تو آخرت یاد دلائیگا۔

جب کبھی کوئی کہے کہ وہ تو آپ کی کہی ہوئی بات پہلے سے جانتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ سخت احساس کمتری میں مبتلا ہے اور اپنی لاعلمی پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔ ہرگز یقین نہ کیجئے جب کوئی آپ سے کتاب مانگے اور کہے کہ وہ پڑھ کر جلد ہی واپس کر دے گا۔۔ اس لئے کہ اس کا ارادہ قطعی نہیں ہوتا کہ وہ کتاب پڑھ کر واپس کر دے، کہتے ہیں کہ جو مستعار مانگی ہوئی کتاب لوٹا دے، وہ بڑا ہی بے وقوف ہے اور اس سے بڑا بے وقوف وہ ہے جو کتاب کسی کو مستعار دے۔ مانگے تانگے کی کتابوں سے ایک بڑا گھریلو کتب خانہ ضرور بن جاتا مگر ان کے لئے الماریاں تو مانگے سے نہیں ملتیں۔

یہ بھی سچ نہ مانئے گر کوئی کہے کہ اس نے سگریٹ پینا چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے کہ ایسا دعویٰ کرنے والے عمر تمام یہی دعوے کرتے رہتے ہیں سگریٹ نوشی چھوڑتے ضرور ہیں لیکن کچھ ہی دنوں کے لئے۔ جبکہ ان کی قوت ارادی زور کرتی ہے اور یہ کچھ کچھ دنوں کے وقفے سے ضرور بلند ہوتی ہے۔

کوئی کہے کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں کہا۔ کبھی کسی کا احسان نہیں اٹھایا تو اس کا مطلب صاف ہوتا ہے۔

آپ نے ضرور ایسی دعوتیں کھائی ہوں گی کہ جن میں صاحب خانہ اور بیگم دونوں ہی یہ دعویٰ کریں گے کہ بیگم نے ساری چیزیں خود اپنے ہاتھ سے پکائی ہیں اور بنائی ہیں۔ بھلا اس بات پر کیا اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ کبھی پرانی موٹر کی خرید و فروخت کا سلسلہ ہو تو ضرور آپ نے بیچنے والے کی زبان سے یہ بات سنی ہو گی کہ اس دام میں وہ بہت سستی ہے اور یہ بھی کہ اگر بعد میں بھی کوئی خرابی نکلے تو پورے دام لوٹا دیئے جائیں گے۔ بھلا ایک بار مشنری کا سودا

ہو جائے تو کون واپس لیتا ہے۔

نوجوان حساس لڑکیوں سے بالعموم کہا جاتا ہے کہ آپ جیسی حسین لڑکی ہم نے نہیں دیکھی۔ بھلا ان سے الٹ کر پوچھئے تو یہ جملہ کتنی لڑکیوں سے کہا گیا ہے۔

کہاوت بھی خوب ہوتی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ بھونکنے والے کتے کاٹتے نہیں، اور اس کا کیا تیقن کہ بھونکنے والا کتا خاموش ہو جائے اور کاٹنے کا ارادہ رو بعمل نہ لائے، کہتے ہیں گرجتے بادل برستے نہیں ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ گرجتے گرجتے بادل خوب برسنے لگے۔

صبر کا پھل میٹھا۔ جبکہ صبر مجبوری کا دوسرا نام ہے۔ یہ محاورہ کتنا غلط لگتا ہے کتے کی دم ٹیڑھی کی ٹیڑھی۔ اب بتائیے کہ اس کے ٹیڑھے ہونے سے خود اس کو یا اس کے مالک کو یا کسی اور کو کیا نقصان پہونچ رہا ہے۔

اور پھر دن میں کتنی بار یہ جملہ سننے کو ملتا ہے: "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی"۔ بتائیے ملتے ہی خوشی ہر ایک کے نصیب میں کہاں سے ٹپک پڑی۔

یہ تو ہوئیں روزمرہ کی باتیں جن کو ماننا یا نہ ماننا آپ کے اختیار تمیزی پر منحصر ہے۔ اب [illegible]یا سے ہٹ کر اس دنیا میں چلیں کہ جہاں محیر العقول باتیں ہوتی ہیں۔ اور جن کو ماننے پر دل [illegible] ہے بھی ماننا پڑتا ہے کہ چشم دید واقعات ہیں اور حق الیقین اور عین الیقین پر مبنی۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ توہم پرستی صرف ہندوستان میں ہے اور وہ بھی ان پڑھ جاہلوں میں لیکن امریکہ جیسے متمدن اور ترقی یافتہ ملک کے بعض دور افتادہ علاقوں میں ایسے لوگ آج بھی پائے جاتے ہیں کہ جو ہمارے ہم نام ہیں یعنی ریڈ انڈین یا امریکن انڈین جن میں شاید

اسی نام کی مناسبت سے ایسی باتیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ جو عقل و حواس کو ماؤف کر دیتی ہیں.

ان ریڈ انڈین قبائلیوں کی غربت فاقہ کشی درماندگی جہالت اس انتہا تک پہنچی ہوئی ہے کہ جو ہماری پسماندہ اقوام سے بھی بڑھ کر ہے. چاہے وہ ہریجن ہوں کہ گری جن یہ بنجر محصورہ علاقوں میں رہتے ہیں جن کو انڈین رزرویشن کہا جاتا ہے انھیں پینے کا پانی تو جوں توں مل ہی جاتا ہے لیکن حمام کے لئے پانی کی سوچ ہی نہیں سکتے. نہانے کے لئے یہ موزوں چٹانوں کو آگ جلا کر خوب تپاتے ہیں ہیں اور ان پر بیٹھ کر پسینے سے نہا لیتے ہیں، البتہ بعض محروسہ و محصورہ علاقوں میں قدرتی تیل برآمد ہوا ہے وہاں پر ریڈ انڈین تیل کی رائلٹی کی وجہ سے بڑی شاندار اور عیش و آرام کی زندگی گذار رہے ہیں. بڑی بڑی قیمتی کیڈلاک جیسی موٹروں میں گھومتے پھرتے ہیں، مردوں کے سر پر بھی چوٹیاں ہوتی ہیں. بڑی فیلٹ ہیٹ پہنتے ہیں ہاتھ کی بنی ہوئی کمبل کندھوں پر پڑی ہوتی ہے. بکئی کے بھٹوں کے پائپ پیتے ہیں. جس میں سب سے مہنگا تمباکو استعمال کرتے ہیں. ان کے چھوٹے چھوٹے دیہات میں کچی مٹی کے مکان ہوتے ہیں. یا چھولداری جیسی ٹی پی میں رہتے ہیں. یورپ سے آکر بسنے والے گورے لوگوں سے یعنی وہ جو اب امریکن کہلانے لگے ہیں ان سے ریڈ انڈین قبائلیوں کو شدید قسم کی نفرت ہے. ہم نے ایک جگہ دیکھا کہ ایک ریڈ انڈین نے ریسٹورنٹ میں خوب سا کھانا منگا کر کھایا اور پھر مزید چیزیں آرڈر کئے جا رہا تھا. گورے امریکن نے خوش مذاقی سے کہا "آپ کی بھوک تو خوب ہے کاش کہ تمہاری بھوک میری ہوتی" ریڈ انڈین اس بات پر بہت برافروختہ ہو کر بولا "ہم کو تم سے بے حد نفرت ہے. تم لوگوں نے ہمارا سب کچھ چھین لیا اور اب ہماری بھوک بھی اپنانا چاہتے ہو"

ھاں، تو بات ان کی پسماندگی اور دور افتادگی کی تھی کہ جہاں ان کو طبی امداد تو کجا پہلی امداد بھی نصیب نہیں ہوتی حالانکہ اطراف و اکناف کے سب ہی ہسپتالوں میں ہیلی کوپٹر اور چھوٹے ہوائی جہاز کی ایمبولنس تیار رہتی ہیں۔ انھیں ان ڈاکٹروں اور اسپتالوں میں قطعاً اعتقاد نہیں وہ تو آج بھی اپنے جادوگر ڈاکٹر کو مانتے ہیں چنانچہ امریکہ کی ریاست ایری زونا میں نیاواہو نام کے قبیلہ کے ساتھ مجھے ونڈوراک میں ۱۹۵۴ء میں یونائٹیڈ سٹیٹس کی طرف سے کام کرنیکا موقع ملا تو میری عین خواہش تھی کہ ان کے جادوگر ڈاکٹر کے کرشمے بذات خود دیکھوں کہ جو مُردوں کو جلاتے ہیں اور مرتوں کو جان بخشتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی جگہ یے بی چی ناچ کے ذریعے علاج کی اطلاع ملتے ہی پہونچ گیا جہاں گھوڑا گاڑیوں کے بجائے گھوڑوں کی طاقت کی موٹریں بھی تھیں اور گیارہ دن تک کھلے میدان میں پڑاؤ ڈالا گیا تھا۔ کینسر کے لاعلاج مریض کو ایک چھوٹے سے کمرے والے گھر میں جس کو ہوگان کہا جاتا ہے لٹا کر جڑی بوٹیوں کے عرق سے لیپ پوت کر اس کے اطراف ریتی بچھا کر اس پہ رنگولی کی ہوئی تھی دکھ بیماری کو بجلی کڑکانے والے دیوتا کا غصہ سمجھا جاتا ہے، اس لئے وچ ڈاکٹر اور ساتھی اسی دیوتا کی برتری اور عظمت کے گانے گاتے ہیں۔ آسمانی بجلی سے جلے ہوئے درخت کی ٹہنیاں مریض کے جسم پہ جھاڑ پونچھ کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ اطراف میں سیکڑوں کی تعداد میں کھڑے ہوئے قبائلی اپنے کمر پٹوں کو ہوا میں ہلا ہلا کر کوڑوں کی طرح پٹختے ہیں، اور مسلسل گاتے رہتے ہیں اور ڈاکٹر کے ساتھی اپنے چہروں پہ نقاب لگائے پروں کو جسم پہ چپکائے گہرے رنگوں سے رنگے رنگائے ناچ کا سماں جمائے رہتے ہیں اور ان کے سر پہ ہرن کی کھال پڑی رہتی ہے۔ جس کی دم پہ بھی چٹخنے لگتے رہتے ہیں۔ چار چار گھنٹے سے ٹولیاں بدلتی جاتی ہیں اور تازہ

دم لوگ شریک ہوتے جاتے ہیں اطراف میں میلہ لگا ہوتا ہے گھوڑے گاڑیوں کے سوا کئی گھوڑوں کی طاقت والی موٹریں بھی رہتی ہیں خمیری روٹیاں تنوروں پر پکتی رہتی ہیں.

کچھ لوگ گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتے ہیں. ریت کو اپنے ہاتھوں میں لے کر زمین پر بکھیرا جاتا ہے.

کچھ اور لوگ جنگلی پھولوں کی پتیاں بکھیرتے ہیں اور ساتھ ساتھ منتر دہرائے جاتے ہیں. یہ سب کچھ گیارہ دن تک چلتا رہتا ہے. گیارہویں دن میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دیوتاؤں کو حاضر وناظر جان کر رنگی ہوئی ریت زمین پر بکھیر دی جاتی ہے رنگوں کو خلط ملط کر دیا جاتا ہے پھول پتے ہوا میں اڑا دیئے جاتے ہیں اور وہ انتظار کی گھڑی آجاتی ہے کہ جب یکلخت سب خاموش ہو جاتے ہیں اور ۱۱ دن کی مسلسل بن بناہٹ اور شور ختم ہو جاتا ہے. اور جادوگر ڈاکٹر کے حکم پر نیم مردہ مریض جس کو سب ڈاکٹروں نے جواب دیدیا تھا آنکھیں کھولتا ہے اور اٹھ بیٹھتا ہے. نقاہت اور کمزوری چہرے پر عیاں ہے لیکن زندگی کھل اٹھتی ہے اور مریض صحت مند دکھتا ہے. اس کو سرکاری دواخانے میں لے جا کر امتحان کرایا جاتا ہے اور اس کا لاعلاج کینسر غائب ہو جاتا ہے.

البتہ جو جادوگر ڈاکٹر اور اس کے ساتھ مسلسل ناچتے کودتے رہے تھے ان کے ہاتھ اور پیر سن ہو جاتے ہیں. جس کے لئے دواخانے کی نرس مرہم ملتی ہے.

خدا کی قدرت اعتقاد اور ایقان کا ایک اور کرشمہ ہے آپ چاہے مانیں نہ مانیں، پونا سے مہابلیشور کے راستے پر ۱۳ میل کے فاصلے پر جو مشہور درگاہ ہے قمر علی درویش رحمتہ اللہ علیہ کی وہاں کا زندہ کرشمہ آج بھی حیرت میں ڈال دیتا ہے صحن درگاہ میں دو بڑی بڑی پتھر کی چٹانیں ہیں کہ جن کو ۶ / ۸ آدمی اپنی پوری طاقت

سے بھی زمین سے نہیں اٹھا سکتے مگر چھوٹی چٹان کو ۹ آدمی اور بڑی چٹان کو ۱۱ آدمی صرف شہادت کی انگلی کا سہارا دیکر ایک ساتھ ایک آواز میں قمر علی درویش پکاریں تو وہ بڑے بڑے پتھر خود بخود ہوا میں صرف ان 9/11 انگلیوں کے سہارے اٹھنا شروع ہوتے ہیں۔ اور اس وقت تک ہوا میں معلق رہتے ہیں کہ جب تک کسی ایک بھی آدمی کی سانس اور آواز نہ ٹوٹے۔ اس معلق حالت میں لوگوں نے تصویریں بھی لی ہیں۔ اور ہندو مسلم سکھ عیسائی ہر دین و دھرم کے لوگ اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔ لیکن صرف مردوں کو ہاتھ لگانا چاہئے۔

اب دنیا میں یہی کچھ باتیں عقل و فراست، سوجھ بوجھ کو ماؤف کر سکتی ہیں۔

ہنسی کا بیوپار

مرد جب کبھی خرید و فروخت کے لئے نکلتا ہے تو اس کے پیش نظر فوری ضرورت اور استعمال کے لئے اس شئے کی موزونیت، یہی دو باتیں خریداری کی وجہ ہوتی ہیں۔ لیکن جب عورت بازار کا رخ کرتی ہے تو چاہے قبل از قبل خرید و فروخت کا ارادہ ہو کہ نہ ہو شئے مطلوبہ کسی بھی ضرورت کو پورا کرتی ہے یا نہیں، ایسی کوئی بات دماغ میں نہیں ہوتی۔

خواتین کی خریداری محض حسب ذیل وجوہات کی بناء پر ہوتی ہے۔

۱:۔ وہ خاص شئے کسی جان پہچان والے یا اڑوس پڑوس میں کسی کے پاس نہیں ہے تاکہ یہ فخر سے کہہ سکے کہ صرف وہی ایک واحد شخصیت ہے کہ جو ایسی چیز کی مالک ہے۔

۲:۔ یا پھر وہ شئے ہر ایک کے پاس پہلے سے موجود ہے اور یہ کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتی۔

۳:۔ اس لباس یا پوشاک کی وجہ سے وہ دبلی پتلی اور نازک دکھائی دیتی ہے یا اس کی عمر کا بڑا حصہ چھپ جاتا ہے۔

۴:۔ اس لئے کہ وہ بدیسی ہے اور مشکل سے دستیاب ہوتی ہے۔

۵:۔ اس لئے کہ اس کی ہمسایہ خاتون خرید نہ سکیں گی۔

۶:۔ اس لئے کہ سیل میں اس پر اصلی قیمت کا کچھ فی صد رعایتی ڈسکاونٹ مل رہا ہے چاہے وہ کتنا ہی کم ہو اور نظر انداز کیا جا سکتا ہو۔

۷ :۔ اس لئے کہ اس کا کمانے والا شوہر کہتا ہے کہ اسکی خریداری اس کی حیثیت سے باہر ہے۔

۸ :۔ دکاندار نے دعویٰ کیا ہے کہ اس قسم کی اور اس رنگ یا ڈیزائن کی وہ ایک ہی شئے ہے چاہے وہ ساری ہو کہ پردہ کا کپڑا! گھر کے استعمال کا برتن ہو کہ فرنیچر۔

۹ :۔ ہر خریداری پر مفت انعام ملتے ہیں۔ یا تحفۃً کوئی معمولی سی چیز مل جاتی ہے۔

۱۰ :۔ اس لئے کہ چکانے قیمت اتارنے اور سودا کرنے کا زرین موقع مل رہا ہے۔ باوجود اس کے کہ دکان دار نے جلی حرفوں میں لکھ رکھا ہے 'ایک ہی قیمت' واحد دام۔

بالعموم خواتین کی پسند کی وجوہات غیر معین ہوتی ہیں اور کبھی قائم و دائم نہیں رہتیں۔ اگر ان کی پسند سے مرد کو اختلاف ہو تو یہی تضاد خیال اس کی پسند کو مستقل بنا دیتا ہے

ایک خاتون نے دکان پر ساری پسند کر کے قیمت ادا کر دی۔ اور دکاندار سے چلتے چلتے تاکید سے کہا: "اگر میرے شوہر کو یہ ساری یا اس کے بھاری دام منظور نہ ہوں اور میں ان کے ساتھ لوٹانے آؤں تو تم اس کو ہرگز واپس نہ لینا"

رقمی گنجائش، ضرورت اور پسند سے ہٹ کر بھی کئی باتیں ہوتی ہیں۔ جو خریداری پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اسی سے فائدہ اٹھا کر دکاندار عورتوں کی نفسیات کے پیش نظر بیوپار کے کچھ اور بھی گر تیار کرتے ہیں۔ عورتوں کے ملبوسات کے کاونٹر پر کام کرنے والی سیلس گرل کو ہدایت دی گئی کہ ۱۹ برس سے کم عمر والی لڑکی خریداری کر رہی ہو تو اس کو بتانا کہ جس خاص لباس کی خریدی ہیں وہ دلچسپی لے رہی ہے وہ اس کی عمر میں دو چار سال کا اضافہ کریگا۔ اگر ۲۱ سال سے اوپر کی عمر کی عورت ہے تو یہ کہنا زیادہ موثر ہو گا کہ یہ لباس اس کی عمر ۴/۵ سال ضرور گھٹا دیگا۔ اور اگر ۴۰ سے اوپر کی ادھیڑ عمر کی عورت ہو تو اس کی

عمر کی بات بالکل نہ چھیڑنا بلکہ اس کو بتانا کہ اس دام میں ایسی ساری' پہناوا یا لباس اس کو اور کہیں نہیں مل سکتا. وہ سچ مچ BARGAIN ہے. اس حکمت عملی پر چلا جائے تو ناممکن ہے کہ کوئی خاتون دکان سے خالی ہاتھ لوٹے۔

تجارت میں خرید و فروخت کو دکاندار اپنی صلاحیتوں اور حکمت عملی سے ہر وقت بڑھاتے رہتے ہیں. اس کی دل چسپ مثال یہ ہے کہ رسٹورنٹ میں کھانے کا آرڈر لینے کے پہلے بہرا پوچھا کرتا: "آپ کوئی شربت وغیرہ لیں گے؟" اس پر کوئی بھی آدمی کسی قسم کے شربت کا آرڈر نہیں دیتا' مالک نے اس کو ہدایت کی کہ آئندہ سے وہ اس طرح پوچھے: "انناس کا شربت لیمن اسکاش تازہ لیموں' تربوز کا شربت آج خاص بنے ہیں اس میں سے کون سا حاضر کروں؟" اتنے اچھے نام سن کر منہ میں ضرور پانی آتا ہے اور ایک نہ ایک شربت کا ضرور آرڈر مل جاتا۔ خوب بکری ہونے لگی۔

اپنی پبلسٹی کے لئے نئی کمپنی بہت سارے لوگوں کو شخصی نام سے چٹھیاں بھیج رہی تھی ملازم لڑکی نے غلطی سے کچھ لوگوں کے نام کے لفافے ویسے کے ویسے خالی ہی بھیج دیئے. جن کو لفافوں میں چٹھیاں ملیں انھوں نے تو اس پر کوئی دھیان دیا نہ خط و کتابت کی زحمت گوارا کی. البتہ جن کے پاس خالی لفافے بغیر منسلکات کے پہونچے انھوں نے فوراً لکھا کہ آپ کی چٹھی نہیں ملی اس پر کمپنی نے معذرت کے ساتھ پھر سے بڑے اچھے خطوط لکھے اور اپنی پبلسٹی کا مواد پورا بھیجا جس پر کافی توجہ دی گئی اور ان کی اشتہار بازی بھی خوب کامیاب رہی.

اشتہار بازی کی کمپنی کے نمائندے نے ایک چھوٹے سے گاؤں کی سب سے بڑی دکان پر مالک سے پوچھا "آپ اپنی اور اپنے بیوپار کی پبلسٹی کیوں نہیں کرتے؟" مالک نے

کہا " آج چالیس سال سے اس دھندہ میں ہوں کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی "
پبلسٹی کے ماہر نے سامنے کے مندر کی طرف بتا کر پوچھا " یہ بھگوان کا مندر یہاں پر کتنے عرصے سے ہے ؟" مالک نے بتایا کہ سو برس سے زیادہ ہی ہوئے ہوں گے ۔ اشتہار مانگنے والے نے کہا " اور صبح و شام اس کے پجاری گھنٹے بجا کر عقیدتمندوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو بلانے کی کوشش کرتے ہیں "

پالتو پرندوں کی دوکان پر طوطوں کی قیمت سو سو روپے تھی مگر لوگوں کو اس بات کا لالچ ہوتا کہ طوطے کی خریداری پر اس کے ساتھ پنجرہ مفت ملتا تھا ۔

دواؤں کی دوکان پر رات گئے جب کوئی بیمار آدمی کے لئے برف کی تھیلی خریدتا ہے تو اس کے ساتھ برف مفت دیا جاتا ہے ۔ اسی طرح اگر گرم پانی کی تھیلی خریدی جاتی ہے تو دکان سے گرم پانی بھی دیا جاتا ہے اس چھوٹی سی سہولت کے لئے لوگ دور دور سے اسی دکان پر جانا پسند کرتے ہیں ۔

ایک ہوٹل والے نے اپنے باقاعدہ مینو کارڈ پر ایک نئی ڈش کو شریک کیا تو اس کی طرف کسی کا بھی دھیان نہیں جاتا تھا اور وہ نئی ڈش بکتی نہیں تھی ، ہوٹل والے نے ایک دن پرانے مینو کارڈ پر ایک چھوٹی سی چٹھی الٹی چپکا دی ۔ اب تو ہر آدمی اسی چٹھی کو سیدھا کر کے پڑھنے کی کوشش کرتا اور آخر کار وہی ڈش آرڈر کرتا تجسس آدمی کو غیر ضروری باتوں پر لازماً مائل کرتا ہے ۔

بتائی ہوئی قیمت کو چکانا اور گھٹانا اس میں بلا کی جاذبیت ہے اس کو ایک طرح کا دلچسپ مہم بھی کہا جا سکتا ہے ۔

کپڑوں کے دکاندار نے گاہک کو ایک سوٹ پیس بتاکر کہا کہ "یہ سوٹ پیس سوا سو روپے کا ہے مگر میں آپ کو پون سو میں دوں گا کہئے تو کاٹ دوں۔" گاہک بھی ہوشیار تھا اس نے کہا میں تو صرف ۵۰ روپے دوں گا اس چالیس روپے کے سوٹ پیس کے۔" دکاندار "چونکہ آپ ہمارے مستقل گاہک ہیں آپکی قیمت منظور ہے لے جائیے صاحب پچاس روپے میں۔" کہاں تو قیمت تھی سوا سو اور کدھر پچاس روپیہ پر معاملہ طے ہوا۔

دوکاندار کے دوست نے پوچھا "کہو یار آج کل خرید و فروخت کا کیا حال ہے"۔ دوکاندار نے کہا "بیوپار بہت مندا ہے، وہ لوگ بھی نہیں آرہے ہیں کہ جو ادھار خریداری کرتے تھے اور کبھی حساب نہیں چکاتے تھے اور غضب یہ ہوا کہ پچھلے ہفتہ ایک خاتون نے دو ساریاں خریدی تھیں کل وہ واپس کر گئی۔"

اپنی عمر کے تعلق سے سب ہی عورتیں بہت حساس ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کسی راز کو اپنے سینے سے لگائے رکھتی ہیں تو وہ صرف اپنی عمر کا راز ہوتا ہے باقی راز کی باتیں تو سرِ عام طشت از بام کئے کی ہوتی ہیں۔ نیز یہ بھی کہ عورت کی زندگی میں سب سے زیادہ دل چسپ عمر تو اس کا تیسواں سال ہوتا ہے کہ وہ اس کے آگے بڑھتی ہی نہیں۔ لاکھ جتن کئے جاتے ہیں کہ عمر کم دکھائی دے اور کم معلوم پڑے ۔ ایک انگریز خاتون بہت چھان بین کے بعد ایک ہیٹ پسند کرنے کو تھیں کہ سیلس مین نے کہا "آپ کے سر پر یہ ہیٹ بہت موزوں اور دیدہ زیب لگتی ہے۔ اور خاص بات یہ ہے کہ پہننے کے بعد تو آپ اپنی عمر سے ۱۰ سال کم لگتی ہیں" اس خاتون نے وہ ہیٹ فوراً لوٹا دی اور کہا "میں ایسی ٹوپی نہیں پہننا چاہتی کہ اس کو اتارتے ہی دیکھنے والوں کو ۱۰ سال زیادہ عمر کی لگوں۔"

بالعموم عورتیں معمولی سی چیز بھی پسند کرنے کے لئے دکان پر گھنٹوں وقت لگاتی ہیں۔ جس سے سیلز مین کا کافی وقت خراب ہوتا ہے اور بہت سارے دوسرے گاہک خاطر خواہ توجہ نہ ملنے پر دوسری دوکان کا رخ کرتے ہیں۔ اس لئے بہت غور وخوص کے بعد ساریوں کی دوکان کے مالک نے ایک بورڈ لگایا "جو کوئی خاتون ۱۰ منٹ کے اندر اپنی پسند کی خریداری کر لیں گی ان کو قیمت پر ۲۰ فیصد رعایت دی جائے گی"

کچھ دن تو اس ترکیب سے جلدی جلدی سیل ہونے لگا لیکن بعد میں عورتوں نے اپنے فطری رجحان کی تسکین کا یہ حل نکالا کہ ایک دو روز پہلے گھنٹوں وقت صرف کر کے پسند کی ساری چن لیتیں، اور پھر دوسرے دن آکر دس منٹ کے اندر اندر خریداری بھی کرتیں اور ۲۰ فیصد رعایت کا فائدہ بھی اٹھاتیں۔

دکاندار کیلئے حاضر جواب اور حاضر دماغ ہونا ضروری ہے۔ تاکہ گاہکوں کے موڈ کو بگڑنے نہ دے اور اپنی تجارت پر برا اثر نہ ہو، ایک ایسے ہی دکاندار کے پاس سے سگار کا ڈبہ خرید کر گاہک نے کھولا اور دکاندار کو بتایا کہ اس میں سارے سگار سوکھ کر بے مزہ ہوگئے ہیں۔ دکان کے مالک نے موقع کی نزاکت کو سمجھ کر کہا "ارے صاحب، سگار کا ایک ڈبہ خرید کر آپ اتنی شکایتیں کر رہے ہیں۔ میرے پاس تو ایسے ہزار ڈبے پڑے ہیں اب میں کہاں شکایت کرنے جاؤں؟"

دکان کے مالک نے سیلس گرل کو کسی گاہک سے بہت دیر تک بحث ومباحثہ کرتے دیکھ کر بطور نصیحت کہا "تم کو اپنے گاہک سے کبھی حجت نہیں کرنا چاہیئے۔ جانتی ہو نا کہ خریدار ہمیشہ صحیح ہوتا ہے" لڑکی نے کہا "پر وہ کہتا تھا کہ اس دکان کا مالک بے حد دغاباز اور جھوٹا ہے"

گھر گھر پھیری لگا کر بکری کرنے والے سے اس کی خوش حالی کا راز پوچھا تو اس نے بتایا "جب کبھی کوئی عورت دروازہ پر آتی ہے تو میں اس سے پوچھتا ہوں" صاحبزادی تمہاری اماں گھر پر ہیں؟ اس پر کم عمری کا داؤ ایسا کاری لگتا ہے کہ وہ ہر چیز کی خریداری پر آمادہ ہو جاتی ہیں"

سیلس مین نے کپڑے دھلائی کی مشین کی کارکردگی کی تعریف کرتے ہوئے کہا: "اس سے دھلائی کی آدھی محنت کم ہو جائے گی" خاتون نے کہا: "تب تو دو مشینیں خرید لیں گے ہم"

جوتوں کی الگ الگ کمپنیوں کے امریکن اور انگریز سیلس مین دونوں بھی اتفاقاً ایک ساتھ افریقہ پہونچے۔ دونوں نے بھی دیہات پھر کر دیکھا کہ سب ہی ننگے پیر پھرتے ہیں انگریز نے اپنی کمپنی کو تار دیا: "یہاں تو کوئی جوتا پہننا جانتا ہی نہیں، اس لئے فوراً لوٹ رہا ہوں" امریکن نے تار دیا۔ "یہاں کسی کے پیر میں جوتے نہیں فوراً دس ہزار جوڑ جوتے روانہ کر دیئے، مارکٹ اچھا ہے"

بڑے فارم پر میاں بیوی نے مل کر مرغبانی شروع کی جہاں شوہر انڈے بھی بیچا کرتا۔ ننھے بچے نے ایکدن باپ کے بڑے بڑے ہاتھوں میں انڈے دیکھ کر پتہ کی بات کہی: "ڈیڈی انڈے بیچنے کا کام ممی کے سپرد کیجئے۔ ان کے نازک نازک ہاتھوں میں انڈے بڑے دکھائی دیں گے اور لوگ اچھی قیمت پر انڈے خریدیں گے"

روایاتی بیوپار اور خرید و فروخت کا زمانہ گذر گیا۔ اب تو ہر قدم پر نئی نئی ترکیبیں سوچنا اور نئی حکمت عملی پر کارگر ہونا پڑتا ہے تاکہ اپنا کاروبار دوسروں سے زیادہ چلے۔ اور اس تگ و دو میں بڑی دل چسپ حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں۔

ایک قہقہہ

زندگی میں ہزار ہا کٹھنائیاں ہیں، قدم قدم پر دکھ ہیں، سیکڑوں بیماریاں ہیں ناگہانی حادثے ہیں۔ انسان ان سب کا مقابلہ محض اس وجہ سے کر سکتا ہے کہ قدرت نے اس کو ایک ایسی حس عطا کی ہے کہ جو اُن سب کو نظر انداز کرنے کی قوت رکھتی ہے خوشی کے موقعہ پر ہنس لینا تو ایک فطری تقاضا ہے۔ لیکن مصیبت کے لمحوں میں ہنس کر ان پر قابو پا لینا اس کے کردار کی بڑائی ہے اور یہی چیز اس کو زندہ رکھتی ہے، خوشی کی معمولی سی بات ہو تو انسان کی آنکھوں میں مسکراہٹ چمک اٹھتی ہے کچھ زیادہ خوشی کی بات ہو تو ہونٹوں پر مسکان کھیل جاتی ہے کبھی زیر لب تبسّم سے بڑھ کر دبی دبی ہنسی کھل اٹھتی ہے۔ کبھی یہ گلے میں پھنس کر گلوگیر ہنسی کہلاتی ہے اور جو کوئی ایسا واقعہ ہو کہ جو دل و دماغ کو طراوت پہونچائے تو یہ ہنسی سے بڑھ کر قہقہہ کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ جیسے کہ کسی نے بے تحاشا گدگدی کی ہو اور وہ جسم کے رُوم رُوم میں سما کر پھٹ پڑی ہو۔ کبھی یہ قہقہے قلقل اور قلقاری سے آگے نہیں بڑھتے اور جو قہقہے بہت آگے بڑھ جاتے ہیں تو دیوار قہقہہ کھڑا کر دیتے ہیں یا فلک شگاف قہقہوں کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں ہربرٹ اسپنسر کا کہنا ہے کہ انسان

کے اندر جو زائد قوت یا توانائی ہوتی ہے وہ ہنسی سے چھلک جاتی ہے اور جو یہ بہت زیادہ ہو تو قہقہہ کی شکل میں پھٹ پڑتی ہے لیکن ہنسی محض ایک فطری تقاضا نہیں کہ جس طرح انسان وقت پر کھا پی لیتا ہے یا اپنی دوسری ضروریات پوری کر لیتا ہے۔ وقت پر سو جاتا ہے پھر جاگتا ہے اصل حقیقت یہ ہے کہ ہنسی کے پیچھے بہت ساری حسیات شعور اور حواس کام کرتے ہیں جو اس کو موقعہ بے موقعہ اس کے لئے اکساتے بھی ہیں ابھارتے بھی ہیں۔

تاریخ سے بہت پہلے کے انسان کا تصور کیجئے تو نظر کے سامنے ایک لحیم شحیم انسان آکھڑا ہوتا ہے کہ جس کو ایک ایسے ماحول میں زندگی بسر کرنا تھا کہ جو اس وقت تک اسکے زیر اقتدار نہیں تھا۔ قدرت کے عناصر بھی اس کے قابو میں نہیں تھے جنگلی درندے خونخوار رقیب کی طرح اس کے اطراف گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی حفاظت بقا اور زندگی کے لئے اس کو اپنی ساری توانائیاں اور پوری قوت استعمال کرنا ہوتا ہے، اپنا پیٹ بھرنے کے لئے جانوروں کو مارنا کاٹنا پیٹنا ہوتا ہے اور اکثر تو اپنے ہم جنسوں سے بھی لڑائی مول لینا ہوتا ہے! ایسے میں وہ جب کبھی اپنے مدمقابل کو زیر کرنے میں کامیاب ہوتا ہے تو یکایک شادمانی اور کامرانی کے جذبات ابھرتے ہیں اور وہ بے معنی سے نعرے لگاتا ہے اور حلق سے ایسی آوازیں نکلتی ہیں کہ جو اس کی کامیابی کا اعلان ہوتا ہے۔ ان فتوحات میں جو اس کے ساتھی ہوتے ہیں وہ بھی اسی طرح کی آوازیں نکالتے ہیں اور اپنے اقتدار اور برتری کا جھنڈا گاڑتے ہیں۔

ہزارہا صدیوں کے گزر جانے کے بعد آج بھی وہی جبلت برقرار ہے اور انسان

احساس برتری اور احساس کامرانی کے تحت مُنہ بناتا ہے تو وہ مسکراہٹ کھلاتی ہے اور جو بلند آوازیں نکلتی ہیں وہ قہقہے کہلاتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں صدیوں کی مشق اور تہذیب وتمدن کی بندش نے اس کو ایک سلیقہ عطا کیا ہے اور ایک اسلوب دیا ہے، جو شائستہ بھی ہے اور روا بھی ہی اسی قہقہہ نے انسانوں کو جانوروں سے بلند درجہ عطا کیا ہے جس کی وجہ سے اس کو حیوان ظریف کہا جاتا ہے یہی ایک علامت ہے کہ جو یہ بتاتی ہے کہ قہقہہ لگانے والا انسان خود اعتمادی رکھتا ہے۔ زندگی سے مطمئن ہے لیکن یہی ہنسی اگر دوسروں کی کمزوریوں کوتاہیوں خامیوں اور نقائص پر ہو تو رکیک ہو جاتی ہے۔ اور جب یہ طنز یہ ہوتی ہے تو دوسروں پر تیر ونشتر کا کام کرتی ہے اور زہر خند کہلاتی ہے۔ اگر ایک آدمی کی مذموم حرکتوں پر سب ہی ہنسنے لگیں تو یہ جگ ہنسائی ہو جاتی ہے۔ کبھی انسان خواہ مخواہ ہی ہنسنے لگے تو یہ اس کے دماغ کی خرابی کا مظہر ہو جاتی ہے اور جو کوئی مسلسل ہنستا ہی رہے تو اس کے ہنسوڑپن کو معیوب اور خلاف تہذیب سمجھا جاتا ہے۔

کوئی ہنسی کی معقول بات پر بھی نہ ہنسے تو یہ اس بات کا بین ثبوت ہوگا کہ اس شخص میں شئے لطیف کی کمی ہے جو نہ خود ہنسے اور نہ کسی اور کو ہنسنے پر اکسائے تو اس میں مزاح کی حس کا فقدان ہوگا۔ اسی لئے کہتے ہیں۔

خزاں کے دور میں جو مسکرا نہیں سکتے
وہ لطف فصل بہاراں اٹھا نہیں سکتے

انسان ہنستا ہے تو اس کے اعصاب کا اضمحلال گھٹ جاتا ہے ورنہ انسانی چہرہ کا کھچاؤ اس بات کا آئینہ دار ہوتا ہے کہ اس کے دل و دماغ میں غم و غصہ، نفرت یا یاسیت بیزارگی عدم اعتمادی اور ایسے ہی جذبات بھرے پڑے ہیں۔ اس لئے انسان کو چاہیئے کہ باموقعہ ہنسی کو اپنا مسلک بنائے اور

ہنسیں تو اس طرح ہنسیں کلی کلی نثار ہو
جئیں تو اس طرح جئیں کہ ہر خوشی نثار ہو

پھولوں کی مہک اور خوشبو سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ قوت شامہ (سونگھنے کی حس) رنگوں کے حسن و نکھار کے لیئے بصارت موسیقی نغمہ اور سازو ترنم کے لئے قوت سامعہ ضروری ہیں۔ اسی طرح مزاح کی حس کے بغیر کتنی ہی دلچسپ بات ہو کتنی ہی خوش مذاقی کا دور چلتا ہو تو جو شخص اس سے محروم ہو لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ بالفاظ دیگر

یہ دل کی مستی ہے جس نے مچائی ہے ہلچل
نشہ شراب میں ہوتا تو ناچتی بوتل

پھولوں کی خوشبو باغوں میں اگنے والے اور گملوں میں پرورش پانے والے درختوں سے بھی مہکتی ہی اور عطر یا سینٹ کی بوتلوں سے بھی یہ تو عام آدمیوں کی حس پر منحصر ہی کہ وہ کیسے اور کہاں پر اس خوشبو سے لطف اندوز ہوتے ہیں اگر کسی کی ناک بند ہو یا سونگھنے کی حس کمزور ہو تو اس میں خوشبو کا تو کوئی دوش نہیں اسی طرح اگر کوئی لطیفہ یا چٹکلہ کسی کی حیات کو چھو گئے نہیں تو اس میں اس لطیفہ کا یا اس ظرافت کا کیا

قصور۔ جس طرح لوگ کھیل کود یا ورزش سے اپنے اعضائے جسمانی کو چست رکھتے ہیں ہر خردمند اور صاحب عقل پر لازم ہے کہ وہ بھی مزاح کی حس کو چاق و چوبند رکھے اور ہنسنے ہنسانے قہقہے اڑانے کے کسی موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہ دے۔

بعض لوگ اتنے قنوطیت پسند اور یاس پرست ہوتے ہیں کہ انھیں ہر بات میں رنج کا پہلو نظر آتا ہے۔ اگر گلاس میں شربت ہو تو وہ کہیں گے یہ تو آدھا گلاس خالی ہے حالانکہ خوش دل لوگ اس کو کہیں گے کہ شربت سے آدھا گلاس بھرا ہی۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ جو پھول کی کلی کو چٹکتے ہوئے دیکھتے ہیں تو پریشان ہو جاتے ہیں کہ بس اب یہ فنا ہونے کے لئے کھلی ہے اور کہیں گے ؎

غنچے تیری زندگی پہ دل ہلتا ہے
بس ایک تبسّم کے لئے کھلتا ہے

اس سوچ کا جواب اس کے دوسرے شعر میں سنئے ؎

غنچے نے کہا اس چمن میں بابا
یہ ایک تبسّم بھی کسے ملتا ہے

کلی کے کھلنے اور ماحول کو عطر بیز کرنے کے متعلق یہ مشاہدہ اور دلچسپ ہے

یہ کون زیر زمیں اس کو گدگداتا ہے
کہ مسکراتی ہوئی ہر کلی نکلتی ہے

سب سے آسان تو یہ ہے کہ انسان دوسروں پر ہنسے یا ایسے واقعہ پر ہنسے کہ جس میں خود کی انا (EGO) یا خودی کو دھکا نہ لگتا ہو طنز و مزاح کا نشانہ کوئی

اور ہو کسی اور کی سبکی ہو رہی ہو کوئی گر پڑتا ہو کسی میں جسمانی عیب ہو کسی کی زبان میں لکنت ہو کوئی بے تحاشا لمبا ہو یا ٹھنگنا ہو لنگڑاتا ہو تو اس پر ہنس لینا تو روز مرہ کا معمول ہے لیکن کوئی بھی اپنی برائی اپنا عیب نہ دیکھتا ہے نہ اس پر ہنسنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ بقول بہادر شاہ ظفرؔ

نہ تھی حال کی اپنے ہمیں خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

پنڈت جواہر لال نہرو نے سر آسن یعنی سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کرنے کا آسن کرنا شروع کیا تو انھوں نے بڑی دل چسپ بات کہی۔ دوران خون کے اس طرح پلٹ جانے سے جسمانی طور پر جو بھی مانے ہوئے فوائد ہیں وہ رہے ایک طرف لیکن دنیا کو ایک نئے زاویئے سے دیکھنے کے بعد ایک نئی جہت ان کو نظر آئی جو کچھ مضحک بھی تھی لیکن اس سے ان کو ایک نئی سوجھ ایک نئی بصیرت ملی جس سے ان کے اندر مزاح کی حس جاگ اٹھی اور وہ زیادہ ہشاش بشاش رہنے لگے

اسی وسعت نظر سے ہم لوگ بہت سارے مسائل باآسانی حل کر سکتے ہیں کتنی ہی ان گنت مشکلوں سے نپٹ سکتے ہیں اور جو اس بصیرت سے سرفراز ہو جاتے ہیں وہ خوش مذاق خوش دل کہلاتے ہیں یہ خود بھی خوش رہتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی خوش کرتے ہیں

مہاتما گاندھی کی خوش مذاقی نے انھیں سیاسی مصائب و آلام کے دور میں دیش کی آزادی کی کڑی جد و جہد میں بھی انھیں ہنس مکھ اور تازہ دم رکھا۔ یہی

خوش دلی ان کے ملنے والوں میں غیر مرئی طور پر انبساط اور اندرونی خوشی کے جذبات کو ابھارتی تھی اور طاقت کی ٹانک کے انجکشن کی طرح رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے ایک بار برطانوی اخبار کے نمائندے نے باپو سے طنزاً پوچھا ہندوستانیوں نے آپ کو اپنے دیش کی نمائندگی کے لئے کیوں چنا ہے کیا آپ سے اچھا لیڈر انھیں نہیں مل سکتا تھا؟ باپو نے بڑی خاطر جمعی سے جواب دیا شاید یہ بات ہو کہ ان کے خیال میں برطانیہ کے مقابلے کے لئے میری جتنی صلاحیت بہت کافی ہوگی۔ کڑوی بات کو کس خوبی سے اپنے آپ پر جھیل لیا اور ساتھ ہی برجستہ جواب بھی دے دیا۔ یہ ہمارے لئے ایک بڑا سبق ہے۔

اس سے بھی زیادہ اعلیٰ حوصلہ اس شخص کا ہوتا ہے کہ جو نہ صرف اپنے عیب و ہنر دیکھ لیتا ہے بلکہ ان کا مذاق اڑا سکتا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ کالج میں ہم نے طالب علموں اور پروفیسروں کے مابین فٹ بال میچ کے لئے ٹیمیں بنائیں تو کالج کے ہر دلعزیز پروفیسر ویرا بھدر ڈو کو پروفیسروں کی ٹیم کا کپتان بنایا۔ یہ بذاتِ خود بہت ہی منحنی لاغر پستہ قد اور نازک اندام تھے اور فٹ بال تو کیا پنگ پانگ کو بھی ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے۔ جب فہرست ان کے سامنے رکھی گئی تو انھوں نے اپنی فطری مسکراہٹ کے ساتھ اپنے نام کے آگے لکھا "کیا ایسے پروفیسر کہ جو فٹ بال سے بھی کم وزن رکھتے ہیں اس میچ سے مستثنیٰ نہیں رکھے جا سکتے"۔ اپنے آپ پر ایسی زبردست چوٹ کی تھی انھوں نے کہ ہم سب آج تک بھی اس واقعہ کو یاد کر کے بے تحاشا قہقہے لگاتے ہیں۔

جارج برناڈ شا سے ایک بہت ہی حسین اداکارہ نے کہا "میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں کہ اس سنجوگ سے جو اولاد ہو گی وہ میری طرح حسین اور آپ کی طرح ذہین اور لائق و فائق ہو گی"۔

برناڈ شا نے اپنی ہئیت کو پیش نظر رکھ کر برجستہ کہا "اور جو اس کا الٹا ہو گیا تو" (یعنی شکل و صورت میری اور عقل آپ کی)

اردو شاعری میں اس قسم کے مزاح میں حضرت غالبؔ کا درجہ بہت اونچا ہے انھوں نے اپنے آپ پر طنز و استہزاء کے وار کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ اپنی کمزوریوں کو کبھی چھپایا نہیں ؎

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت دیکھا چاہیئے

یہ تو ان کی اپنی شکل و صورت کے بارے میں تھا لیکن انھوں نے اپنے کردار کو بھی اپنے ہاتھوں مسلنے سے گریز نہیں کیا ؎

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

اسی طرح حضرت اکبرؔ الٰہ آبادی نے بھی خوب چوٹیں چلی ہیں۔ اور خود کو اپنا نشانہ بنایا ہے۔

بھیا رنگ یہی ہے اچھا
ہم بھی کالے یار بھی کالا

ایک جگہ اور کہتے ہیں ؎

عاشقی کا ہو برا اس نے بگاڑے سب کام
ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی اے ہو گئے

مارک ٹوویں نے مزاح کو بجلی سے تعبیر کیا ہے اور اس کی دو قسمیں بتائی ہیں ایک تو وہ ٹھنڈی بجلی کہ جو روشنی دیتی ہے اور اندھیروں کو دور کرتی ہے دوسری وہ آسمانی بجلی کہ جو گرتی ہے جلا کر خاک کر ڈالتی ہے۔ خود بر داشتہ مزاح ٹھنڈی بجلی ہے کہ جو خوشیاں بکھیرتی ہے ہنسی اور قہقہے لٹاتی ہے اور دوسری قسم کی بجلی وہ مذاق ہے کہ جو دوسروں کی کھلی اڑاتا ہے دوسروں کے عیب ٹٹول ٹٹول کر جگ ہنسائی کے لئے پیش کرتا ہے اور ایذا رسانی کا باعث ہوتا ہے۔

انگریزی ادب میں پی، جی، ووڈ ھاؤز نے "جنٹلمین کے جنٹلمین" یعنی بہرا کے ایک خاص کردار کو سامنے رکھ کر اتنی ساری مزاحیہ ناولیں لکھیں کہ بہرے کو زندۂ جاوید کر دیا۔ ان کی یہ تخلیق ایک ایسا بہرا ہے جو غیر شادی شدہ رئیس زادہ کی ذات اور املاک کا کلیتہً مالک ہے۔ اور اس پر اتنا حاوی ہے کہ شاید ہی کسی کے ماں باپ یا اس کی بیوی ہو۔ اُس نے اتنی پابندیاں عاید کر رکھی ہیں کہ مالک کی مجال نہیں کہ اس کی مرضی کو ٹال سکے۔ ہر قدم پر اس رئیس زادہ کو اپنے بہرا کی مدد کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ اور ایسی دل چسپ و نازک صورت حال پیدا کی ہے کہ ظرافت کا دریا بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی طرح مرزا فرحت اللہ بیگ نے انگریز صاحب بہادر کے گھر کو چلانے والے بہرے کا روپ اپنے خاص مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔

بہرا

یہ بہرا انگریز صاحب بہادر کے گھر کے معمول پر اجارہ داری رکھتا ہے۔

جی بھر کر لوٹتا ہے اور پھر بھی نیکنام ہے' بھروسے کے قابل ہے دل چڑھا ہے، اس کردار کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے انگریز گھر کی آیا کا کردار بھی بہت اچھی طرح سنوار کر پیش کیا ہے۔ اب نہ تو وہ انگریز ہیں اور نہ اُس قسم کے خرانٹ بہرے!

ہم اپنے اطراف نظر ڈالتے ہیں تو ہوٹل اور ریسٹورنٹ کے بہرے نظر آتے ہیں۔ ہوٹلیں بھی مختلف گریڈ اور ایک سے پانچ تاروں کے درجات میں تقسیم ہو چکی ہیں اور کچھ تو ایسی ہیں جن کا کوئی گریڈ ہے اور نہ کوئی چمکتا یا ماند پڑا ہوا تارہ، بہرکیف ان کا جائزہ بھی خاصی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ گھٹیا درجہ کی ہوٹل، کھانا وڑ، طعام خانے یا بھٹیار خانے ایسی جگہ ہیں کہ جہاں سے صفائی کوسوں دور ہوتی ہے۔ پاکیزگی اور طہارت سے وہ ایسے مبرا ہوتے ہیں کہ جیسے آج کل ہیپی۔ ان میں کام کرنے والوں کو بہرا نہیں کہا جاتا لیکن کام تو وہی کرتے ہیں۔ ان کا کوئی یونیفارم نہیں ہوتا۔ ان کو صرف 'چھوکرا' 'بابوا' کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو 'باہر والا' کہا جاتا ہے اور یہ کھانے پینے کی چیزیں باہر پہونچاتے ہیں۔ ان ہوٹلوں کے کھانے بالعموم ذائقہ دار ہوتے ہیں گو تیز اور مرچ مسالے سے بھرپور نہایت سستے' پتہ نہیں کون کون سے جانوروں کا گوشت اُن کی دیگوں میں جاتا ہے اور کون سی گندگی شریک ہو جاتی ہے۔ مگر چونکہ ان کی دیگیں 'دن رات' ابلتی، کھولتی اور جوش کھاتی رہتی ہیں ان میں زہریلا مادہ بھی پک پکا کر اپنی زہریلی تاثیر کھو دیتا ہے۔

کسی ایسی ہی جگہ جیبوں (زبان) کی نہاری کے ذائقے کی تعریف سن کر ہمارے ایک دوست بڑے شوق سے گئے۔ اور اپنی موٹر ہی میں بیٹھ کر باہر والے کی معرفت نہاری منگوائی، گرم گرم شوربے میں ہاتھ ڈال کر جیب کو نکالا تو پکا ہوا مگر سالم دم کٹا

چوہا ہاتھ لگا' یہ کراہیت کے مارے بہت چیخے چلائے' ہوٹل کے مالک کو بلا کر دھمکی دی کہ اسی وقت پولس کو بلاتے ہیں. مالک نے بڑی خاطر جمعی سے ان کی شکایت سُنی اور بڑے سکون کے ساتھ چوہے کو پلیٹ سے نکال کر خود اپنے منھ میں رکھا اور حلق کے نیچے اتار لیا پھر کہا "چوہا کہاں ہے صاحب! یہ تو جیب ہے آپ تو خواہ مخواہ لفڑا کرتے ہیں" اور پھر اپنی جگہ پہ جسے عرف عام میں "غلّہ" کہا جاتا ہے بڑی متانت سے بیٹھ گیا. اگر اس نے ذرا سی بھی گندہاہٹ کی ہوتی یا ہچکچایا ہوتا تو ضرور پولیس دخل انداز ہوتی اور اس کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا، مگر اب تو شہادت باقی رہی نہ پولیس کوئی کیس بنا سکتی تھی.

اِن ہوٹلوں کا کوئی مینو نہیں ہوتا' لیکن آپ نے پوچھا نہیں کہ کھانے کو کیا کیا ہے اور وہ چھوکرا ساری کی ساری فہرست ایک ہی سانس میں آپ کو سنا دے گا. مٹن چاپ' مٹن فرائی' کباب' کلیجی' گردہ بھیجہ' بریانی' قورمہ وغیرہ وغیرہ اس کی روانی ایسی ہوتی ہے کہ اکثر تو پلٹ کر پوچھنا پڑتا ہے، کبھی ایسا موقع ہو کہ وہ اپنا بزنس ختم کر کے بیٹھا ہو اور آپ کہیں "مٹن چاپ لانا" تو وہ کہے گا "خلاص". پھر آپ قورمہ' کلیجی گردہ' ایک کے بعد ایک پوچھتے جائیے تو ہر وقت "خلاص" کا جواب ملے گا. آپ تنگ آکر پوچھیں "گدھے کا گوشت" تو بھی وہ کہے گا "خلاص"!

حبیبؔ سے روایت ہے کہ عزیزیہ ہوٹل کے سامنے موٹر کھڑا کر کے اس کے مالک کے متعلق پوچھا "جاوید لطیفی ہیں" چھوکرا بھاگا بھاگا گیا اور واپس آکر بولا "خلاص"!

ایرانی یا مغلئی قسم کی ہوٹلوں میں کچھ صاف ستھرے تمیز دار بہرے ضرور نظر آتے ہیں، جن کے ہاتھ میں مینو کارڈ بھی ہوتا ہے اور زیادہ تر یہ یونیفارم بھی پہنے ہوتے ہیں.

کبھی صاف ستھرا، کبھی میلا کچیلا، کسی کا یونیفارم جسم پر برابر ہوتا ہے اور کسی کا اس کے دست و پا سے باہر نکلا ہوتا ہے۔ کوئی تو اپنے قد و قامت سے چھوٹے یونیفارم میں اس طرح لپٹا دکھائی دیتا ہے کہ جیسے ریشم کا کیڑا اپنے کگون سے باہر نکل رہا ہو، بعض اپنے یونیفارم میں اس طرح پھنسے نظر آتے ہیں کہ یہ معلوم کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ وہ یونیفارم پہننے کی کوشش میں ہیں یا یونیفارم اتارنے میں لگے ہیں۔

اِن ہوٹلوں میں بل ضرور پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن ادائیگی ہوٹل کے مالک کے کاؤنٹر پر ہوتی ہے، اس لئے بیرے کو ٹپ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور آپ جب باہر جاتے وقت بل ادا کر رہے ہوں تو وہ بیرا جو آپ کی حضوری میں تھا چلّا کر کہتا بھی ہے کہ دو آدمی، چار روپیہ ستر پیسہ، بل یا جو بھی ہو۔

ایسے ہی کسی جگہ ہمارے ایک دوست گئے، میز پر بیٹھے بھی نہ تھے کہ پانی کے دو چار گلاس میز پر رکھ دیئے گئے۔ اتفاق سے ان کا ہاتھ لگا اور گلاس گر کر چھن سے ٹوٹ گیا۔ یہ کچھ جلدی میں تھے، شرمانتری میں ان سے بیٹھا بھی نہ گیا، یہ اٹھ کر جانے لگے، بیرا چلایا "کھایا نہ پیا، گلاس توڑا - دس آنے"

ان سے ہٹ کر وہ ہوٹلیں ہیں کہ جن کے بیرے اُجلے، چمکیلے سفید کلفدار یونیفارم میں ملبوس ہوتے ہیں۔ ہمارے جیسے لوگ جو روزانہ کے ہلکے پھلکے معمولی کپڑوں میں ہوتے ہیں ان بیروں کے یونیفارم کو دیکھتے ہی ایک احساسِ کمتری سا ہوتا ہے۔ بعض ہوٹلوں میں کوٹ پہننا ضروری ہوتا ہے۔ اور جو آپ کے جسم پر کوٹ نہ ہو تو ہوٹل کی طرف سے صاف ستھرا کوٹ مہیا کیا جاتا ہے، جس کو آپ ڈائننگ ہال سے باہر جاتے وقت لوٹا دیتے ہیں۔ اِن بیروں سے آپ چاہے کسی زبان میں بات کریں یہ صرف انگریزی میں جواب

دیں گے۔ آپ کے ہاتھ میں بڑا ہی دیدہ زیب مینو کارڈ تھما دیں گے اور پھر سر پر سوار ہو جائیں گے کہ آپ اپنا آرڈر دیں جس کو وہ لکھتے جائیں گے اور جیسے ہی آرڈر لینا ختم ہوا، یہ مینو کارڈ آپ کے ہاتھ سے جھپٹ لیں گے، ایسے کہ کہیں آپ کھانے کے ساتھ اس کو بھی ہضم نہ کر لیں۔

ان بڑھیا ہوٹلوں کے بیروں سے نپٹنا اچھا خاصا فن ہے۔ اس کے لئے کچھ خود اعتمادی، اپنی معلومات کے اظہار کا سلیقہ، ہلکی سی بے حیائی اور پھر اصل معاملہ بخشش یعنی ٹِپ کا ہوتا ہے۔ آپ زیادہ دے دیں تو بھی بے وقوف دکھائی دیں۔ اور کم دیں تو سُبکی کا باعث ہوتا ہے۔ کسی صاحب نے خاطر خواہ ٹپ نہیں دی تو بیرے نے ان کی طرف مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور بولا "حضور میں قیافہ شناسی جانتا ہوں اور آپ کے چہرے سے لگتا ہے کہ آپ مُجرّد ہیں۔" انھوں نے کہا "ہاں ہاں صحیح کہتے ہو۔" بیرے نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا "اور بات بتاؤں حضور یہ بھی لگتا ہے کہ آپ کے والد بزرگوار بھی غیر شادی شدہ ہی تھے۔"

ملاحظہ کیجئے، ٹِپ بھی دیکھئے اور اتنے حسین انداز میں گالی بھی سنئے۔

مشہور ہے کہ ایک کروڑ پتی جب کبھی کسی ہوٹل میں کھاتے تو بہت ہی کم بخشش دیا کرتے ایکبار (ایک بار) بیرے نے ان سے کہا "صاحب آپ کے صاحبزادے یہاں آتے ہیں تو اتنی ٹِپ دے جاتے ہیں کہ ہم کو مالا مال کر جاتے ہیں۔" ان صاحب نے جواب دیا ـــ کیوں نہ ہو وہ ایک کروڑ پتی باپ کا بیٹا ہے۔

اس بخشش کے مسئلے کو حل کرنے کے دو بڑے کارگر طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ کھانے سے فارغ ہو چکے ہیں اور بل آپ کے ہاتھ میں تھما کر بیرا آپ کے سامنے

کھڑا ہے۔ اب آپ سوچتے ہیں کہ اس کو کیا ٹپ دیں۔ آپ دل ہی دل میں تصفیہ کر لیتے ہیں کہ بل کا ۱۰ فیصد مناسب رہیگا۔ اور پھر اس کی صورت دیکھ کر چونک پڑتے ہیں۔ خیال آتا ہے "یہ بہرا تو کچھ زیادہ کا مستحق نظر آتا ہے"۔

در حقیقت یہ تو خود مجھ سے زیادہ ٹپ ٹاپ سجا سنورا ہے۔ اس کو کنجوسی کے مارے ۱۰ فی صد ہی دوں تو یہ کچھ نہ کچھ کہے گا اور میری عزت برباد ہو جائے گی۔ اور جو میں نے ضرورت سے زیادہ بھی ٹپ دے دی اور اس نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا تب بھی میں شرم کے مارے پانی پانی ہو جاؤں گا۔ اور پھر آپ سوچتے ہیں۔ یہ اس طرح میز سے لگا کھڑا کھڑا مجھے کیوں گھور رہا ہے۔ میں بے کل ہوا جا رہا ہوں۔ پھر آگے سوچتے ہیں اچھا تو کیا اس نے سروس بہت اچھی کی؟ نہ۔ اس نے بدتمیزی سے کھانا لگایا پھر میں کیوں اس کو بخشش زیادہ دوں؟ ۔ اس لئے نا کہ میں بڑا ہی نروس اور بزدل ہوں؟ اسی لئے نا؟ ... مانتے ہیں کہ یہ کچھ اچھا اور تمیزدار بہرا نہیں، پھر بھی اس کے بال بچے ہوں گے، مہنگائی کے مارے وہ سب پریشان حال ہوں گے۔ اگر اس نے پہلے سوپ اور پھر کافی میرے کپڑوں پر گرائی بھی تو کیا؟ ہاں یہ مرغ بھی تو کچا لایا تھا، مگر اس میں اس کا کیا قصور؟

اچھا تو یہ کریں بل ۱۲ روپیہ کا ہے ۱۰-۱۰ کے نوٹ پلیٹ پر رکھ کر کہہ دیں کہ بقایا روپے وہ رکھ لے۔ یہ تو ہوا ایک طریقہ۔ اب دیکھئے ایک اور صاحب میز پر بیٹھے ہیں بل ہاتھ میں ہے، بہرا بھی دیر سے سامنے ہی کھڑا ہے اور یہ اسی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں "دیکھو جی، ہماری میز کے بہرے کو ذرا بلانا"۔

بہرا کہتا ہے "جی میں ہی تو آپ کا بہرا ہوں"۔

"ارے تم ہی ہمارے بیرے ہو، میں نے تو تمہیں کتنی دیر سے دیکھا ہی نہیں"۔

"جی، جی میں تو یہیں کھڑا ہوں"۔

"اوہ، تو تم یہیں پر تھے، اور جب سوپ کے اندر مکھی دیکھ کر میں چلّایا تھا تب بھی یہیں کھڑے تھے، اور جب جلی بھنی روٹی رکھی تھی تب بھی تم اِدھر ہی تھے؟

"میں تو بے شک اِدھر ہی ہوں آپ نے مجھ سے کہا ہوتا"۔

"ہاں، ہاں میں تو تم ہی سے کہنا چاہتا ہوں مگر تم تھے کہاں پر؟"

"جی صاحب میں تو بیس سال سے بیرے کا کام کر رہا ہوں"۔

"بیس سال سے یہی کام کر رہے ہو اور کچھ بھی ترقی نہیں کی تب تو تم ضرور نکمے، ناکارہ ہوگے"۔

"آپ ایسا کیوں کہتے ہیں صاحب؟"

"میرے خیال میں ہوٹل والے تمہارے بال بچوں کے خیال سے تم کو نوکری سے علیحدہ نہیں کرتے ہوں گے"

"جی میں کسی خیراتی ادارے میں تھوڑے ہی ہوں"۔

"بے شک، بے شک، تب تو تم بخشش وغیرہ بھی قبول نہیں کروگے"۔

"ٹِپ تو ہر شریف آدمی چھوڑ جاتا ہے"۔

"ہاں جی، بغیر محنت، بغیر صفائی، بغیر کام کے بخشش یعنی خیرات نہیں تو اور کیا؟"

اس پر بیرا اپنے پیر ٹیک کر ناراضگی سے کہتا ہے "بہت خوب، مجھے آپکی ٹپ بالکل نہیں چاہیئے"۔

"میں تو بالعموم ۲۰ فیصد ٹِپ چھوڑتا ہوں لیکن آج ....."

"آپ اپنی ٹپ اپنے پاس ہی رکھیئے، مجھے نہیں چاہیئے"۔

"اچھا جی ہم ایسے نامعقول آدمی سے کچھ بحث کرنا نہیں چاہتے، چلتے ہیں"۔ لیجیئے ساری اُلجھن مٹ گئی۔ سرخرو کے سرخرو اور ٹپ کے پیسے جیب میں!

بمبئی کی بارش

عام طور پر تو بے شک و شبہ بمبئی جنت نظیر ہے۔ یہاں جیسی گھما گھمی دن رات کی رونق، بالخصوص رات کی جگمگاہٹ اس عروس البلاد کے سوا اور کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ یہاں کے موسم بھی ایسے ہیں کہ گرما اور سرما کا تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب ایک موسم ختم ہوا اور کب دوسرا شروع ہو گیا۔ البتہ بارش کا موسم بڑی دھوم دھام سے آتا ہے۔ اور اس کی آمد آمد کی نشانیاں بڑی واضح ہیں۔ سب سے پہلے تو چوپاٹی پر قلفی اور چاٹ اور اسی طرح کی دیگر دوکانوں کے اوپر ایک بڑا شامیانہ پڑ جاتا ہے۔ اسی طرح جیسے ایک بڑا ملک دوسرے چھوٹے ملک کے اوپر نیوکلیر چھتری چڑھا دیتا ہے۔ چھتری بھی ہر جگہ نظر آنے لگتی ہے۔ سب سے پہلے تو دوکانوں میں، دکانوں کے باہر فٹ پاتھ پر اور اسٹالوں پر اور پھر اس کے بعد ہر آدمی کے ہاتھ میں اور سر پر بلکہ کبھی لوگوں کی آنکھوں میں بھی۔ ہم جس کو چھتری کہتے ہیں وہ حفاظت و مدافعت دونوں کے کام آتی ہے۔ چنانچہ شہر بمبئی میں جیسے ہی بارش کے موسم کے آغاز کا وقت قریب آتا ہے لوگ چھتری سے لیس ہو کر نکلنا شروع کر دیتے ہیں۔

ہم نے اپنے ایک دوست کو تو اس سج دھج سے نکلتے دیکھا ہے کہ ہاتھ میں دو دو چھتریاں ہوتی ہیں اور ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کہ ہو لے بارش دیکھتے ہیں ہم بھی ہمارا کیا بگاڑ لے گی، بال بیکا ہونا تو بڑی بات ہے ایک بال بھی بھیگ جائے تو جب ہار مان لیں۔ ان کو اسی حال میں کئی بار دیکھ کر ہمت سے ہم نے ایکبار پوچھ ہی لیا۔ بھائی صاحب، یہ دو دو چھتریاں کس لئے ؟ کیا ایک چھتری سے آپ کا بچاؤ نہیں ہو سکتا ؟ انھوں نے مسکراہٹ میں پنہاں بجلیوں کو اسی طرح گراتے ہوئے کہ جس طرح بارش میں بادلوں کی ٹکر سے آسمان پر بجلی کوندجاتی ہے، جواب دیا۔ مجھے ایک بری عادت ہے اکثر جگہ اپنی چھتری رکھ کر بھول جاتا ہوں، اور جب بارش ہوتی ہے تو بہت پچھتا جاتا ہوں۔ اسی لئے احتیاطاً دو چھتریاں ساتھ میں رکھتا ہوں۔ بات معقول لگی اور ہم نے ان کی بات کو سراہا بھی، کچھ دن بعد فلورا فاؤنٹن کے پاس لب سڑک مڈبھیڑ ہوئی تو ان کو بارش میں شرابور دیکھا، اور یہ بھی دیکھا کہ ہاتھ میں ایک چھتری بھی ہے۔ دریافت کرنے پر کہ ماجرا کیا ہے، وہ چمک کر بولے " ایک چھتری تو ہم کہیں بھول گئے۔ اور ارے ! یہ تو ہم کھولنا ہی بھول گئے۔"

اب آپ نے تو جان لیا کہ چھتری اور بارش کا ساتھ چولی دامن کا سا ہے کہ بغیر چھتری کے آپ ایک قدم بھی گھر کے باہر نہیں نکال سکتے۔ ایک اور دوست کا ہمارا ساتھ سینما میں ہوا۔ پکچر ختم ہونے پر باہر نکلنے لگے تو وہ بڑی یاد سے مینجر کے کمرے میں گئے اور اپنی رکھائی ہوئی چھتری کا ٹکٹ بتا کر چھتری حاصل کی اور اس آدمی کو ایک روپیہ بخشش میں دیا۔ ہم نے حیران ہو کر پوچھا بھئی یہ اتنی فیاضی کی ضرورت کیا تھی کہ ایک روپیہ عطا کیا، تو انھوں نے اس طرح ہمیں جواب دیا کہ جیسے کسی بڑے احمق کو

عقل سکھارہے ہوں " دیکھتے نہیں کہ اس نے کتنی بڑھیا اور کیسی نئی چھتری ہم کو دی ہے ؟"

یہ تو رہی بارش اور چھتری کی بات، مگر آپ تو جانتے ہیں کہ انسان کو اپنی جان چاہے جتنی عزیز ہو اس سے کہیں زیادہ اپنے پہننے کے کپڑے عزیز ہوتے ہیں چھتری پر ہی کیوں اکتفا کیا جائے، صاحب عقل لوگوں نے مزید حفاظت کی غرض سے برساتی یعنی واٹر پروف کوٹ بھی ایجاد کر رکھا ہے۔ جس کو بڑے اہتمام سے پہنا جاتا ہے۔ اور اپنے کپڑوں کو محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ پلاسٹک کے ہلکے پھلکے واٹر پروف سے پہلے ربر کے موٹے موٹے لبادے پہنے جاتے تھے۔ جس سے آپ چاہے آسمانی بارش سے بچ جائیں لیکن جسم سے ابلتے ہوئے پسینے کے فواروں سے تو نہیں بچ سکتے تھے۔ اور جتنا اوپر سے بچ جاتے ہیں، اتنا ہی اندر سے بھیگ جاتے ہیں۔ دیکھنے میں تو یہ معقول پہناوا ہوتا ہے لیکن ہم نے بمبئی میں دیکھا ہے کہ لوگ اس طرح الٹ کر بھی پہنتے ہیں کہ اس کے بٹن سامنے کی بجائے پیٹھ کی طرف لگے ہوتے ہیں، یہ کوٹ خاص قسم کا واٹر پروف نہیں ہوتا، بلکہ استعمال میں آنے والے کو ہی اس طرح پہنا جاتا ہے کہ دیکھنے والا پریشان ہو جائے کہ آپ آگے کو آرہے ہیں یا پیچھے جارہے ہیں۔ لیکن اصل معاملہ یہ ہوتا ہے کہ سائیکل اور موٹر سائیکل پر سوار اس کو اس طرح پہن لیتے ہیں تاکہ بارش کا رخ تیز رفتار سواری میں آپ کو محفوظ رکھے۔ ایکبار ہم نے ایک صاحب کو دیکھا جو دفتر کی عمارت میں داخل ہونے کے بعد بڑی متانت سے اپنی پتلون اتارنے لگے۔ اس وقت بہت سارے لوگوں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں، لیکن معاملہ صرف یہ تھا کہ ان کی پتلون بھی واٹر پروف تھی جو انھوں نے اپنی پتلون کے اوپر پہن رکھی تھی۔

بمبئی کی بارش میں ایک اور حفاظتی اہتمام ہوتا ہے۔ جس کو گم بوٹ کہتے ہیں۔

اس کو جوتوں کے اوپر سے پہن لیا جاتا ہے، ان ستر ریجوں کی طرح جنھیں نالوں، کھڈوں اور پانی کے ڈبروں میں سے چل کر جانے میں مزہ آتا ہے۔

اب تصور کیجئے اس بارش کا جو اور جگہوں پر تو بڑے سلیقے سے برستی ہے، ایک رخ قائم رہتا ہے اور وہ اس طرح کہ خاص زاویہ کو سنبھال کر چلیں تو آپ کو چھو نہ سکے۔ پرانے زمانے کا قصہ ہے کہ جب لوگ شمشیر زنی یا تلوار کا ہاتھ چلانے کے ماہر تھے اور کبھی بغیر اپنی تلوار کے باہر نہیں نکلا کرتے تھے۔ ایک بار ایسے کہنہ مشق کو بارش نے آگھیرا، نہ کہیں بچاؤ کی صورت تھی اور نہ ان کو بھیگنے کا شوق تھا، فوراً ہی انھوں نے تلوار کو اس طرح گھمانا شروع کیا کہ بارش کا ایک بھی قطرہ ان کے جسم کو چھو نہ سکا اور یہ بحفاظت تمام اپنے گھر پہونچ گئے۔

بمبئی کی بارش کے تعلق سے جو جی چاہے کہہ لیجئے گھنگھور گھٹاؤں کے ساتھ اور بجلی کی کڑک کے ساتھ برستی ہے لیکن ہم نے تو بمبئی کی بارش میں یہ کبھی نہیں دیکھا۔

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی — جھوم کے آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

ناز ہے تجھ کو برسنے پہ تو اے ابر ذرا — میری آنکھوں کی طرح سے تو برس اب کے برس

مزہ برسات کا چاہو تو ان آنکھوں میں آبیٹھو

سیاہی ہے سفیدی ہے گھٹا ہے ابر باراں ہے

اسی لئے تو بمبئے کے شاعروں نے اس قسم کی شاعری سے کنارہ کرتے ہوئے ترقی پسند شاعری کو اپنایا ہے۔

اپنی پہچان

ہر شخص کو اپنی شخصیت سے پیار ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی انفرادیت کو ہر لحاظ سے ارفع و اعلیٰ سمجھتا ہے۔ اور جو کبھی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ اس کا دوش دوسروں پر ڈال دیتا ہے۔ اور اپنی صلاحیتوں پر آنچ بھی نہیں آنے دیتا۔ اگر آپ ایسے کسی شخص کے ساتھ ہوں اور کہیں آپ کا جانکار آپ کو سلام کرے تو قبل اس کے کہ آپ جواب دیں، یہ خود ہی اس کے سلام کو بڑی خندہ پیشانی اور مسکراہٹ کے ساتھ قبول کر لیں گے۔ اور بعد میں آپ سے کہیں گے ـــ "مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ ان سے کہاں ملا ہوں" مگر وہ ہر گز یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں گے کہ اس سلام کا مستحق کوئی اور تھا یا ہو سکتا ہے اسی طرح اگر راستے میں کانسٹبل آپکو سلام کرے تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسی کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ کانسٹبل ان کو سلام کرے خود ہی سلام قبول کر لیں گے۔ اور اس احساس کی وجہ سے تاویل پیش کریں گے کہ ان کے ماموں کا لڑکا جو محکمہ پولس میں اعلیٰ عہدہ دار ہے اس کے ساتھ اس کانسٹبل نے ان کو دیکھا ہوگا اور اسی وجہ سے وہ مودبانہ سلام کر رہا ہے۔

برخلاف اس کے جو قنوطیت پسند ہوتے ہیں وہ تو دوسروں کی خطاؤں کے لئے بھی خود کو سزاوار سمجھیں گے۔ ان کی ہر حرکت یاسیت اور پریشانی لئے ہوتی ہے۔ ان کو اگر لاٹری میں دوسرا انعام ملے تو اس کا ماتم کریں گے کہ پہلا انعام کیوں نہیں ملا۔ ان کے سامنے شربت کا گلاس رکھا جائے تو وہ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ آدھا بھرا ہے بلکہ یہ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں کہ وہ بھرپور نہیں، اور شربت پینے سے زیادہ ایسی کمی کا غم کھاتے ہیں۔

اس طرح کی جداگانہ شخصیتوں کا تجزیہ کرنے کے بعد، ہم چاہتے ہیں کہ اپنی خود کی انفرادیت اور شخصیت کو جانچنے کے لئے کچھ مشاہدات قلم بند کریں۔

اگر آپ کے ساتھ حسب ذیل واقعات وقوع پذیر ہوتے ہوں تو مان لیجئے کہ آپ اپنی شخصیت اور انفرادیت کھو بیٹھے ہیں اور اب آپ اس موقف میں نہیں کہ آرام کی نیند سو سکیں۔ کچھ کرنا ہوگا اور کچھ کر کے دکھانا ہوگا۔

۱:۔ جب آپ یہ محسوس کریں کہ آپ کے کہے ہوئے لطیفوں پر کوئی بھی نہیں ہنستا ہے اِلّا اس کے کہ وہ درحقیقت پرمذاق ہوں۔

۲:۔ جب آپ پانی مانگیں اور آپ کی بیوی کہے صراحی قریب میں رکھی ہے، اٹھ کر لے لیجئے۔

۳:۔ جب آپ دفتر جانے کے لئے گھر سے نکلیں اور آپ کے آفس کا ساتھی آپکی نظروں کے سامنے موٹر اڑاتا ہوا نکل جائے اور لفٹ کیلئے نہ پوچھے۔

۴:۔ جب آپ اپنے لڑکے کے پوچھنے پر "نہ" کہدیں، اور وہ بھاگے اپنی ماں سے اسی بات کی اجازت کے لئے۔

۵ :۔ جب آپ کسی رسالے کے مدیر کو خط بھیجیں اور وہ بغیر کھولے واپس کر دے ۔

۶ :۔ جب ڈاکیہ گھر پر سے روز گذرے اور آپ کے نام کوئی خط دے نہ چیٹھی ۔

۷ :۔ جب آپ کا اپنا کتا آپکو دیکھ کر بھونکے ۔

۸ :۔ جب آپکے پڑوسی کا لڑکا آپ کے فرزند سے کہے "میرا باپ تمہارے باپ کی پٹائی کر سکتا ہے"۔ اور اس پر آپ کے صاحبزادے کچھ نہ کہیں ۔

۹ :۔ جب آپ اپنے کسی خاص دوست کو کسی تقریب پر پھولوں کا تحفہ بھجوائیں اور وہ یہ بھی نہ پوچھ سکے کہ وہ آپ کا بھیجا ہوا ہے ۔

۱۰ :۔ جب آپ کسی محفل میں یہ دیکھیں کہ سبھوں نے اپنے اپنے چھوٹے گروپ بنا لئے ہیں اور آپ یکہ و تنہا کھڑے ہیں ۔

۱۱ :۔ جب آپ کسی میٹنگ میں رائے شماری کے وقت کسی مسئلہ کے خلاف رائے دیں اور پھر بھی وہ مسئلہ باتفاق رائے منظور ہو جائے ۔

۱۲ :۔ اور جب آپ کے محلہ اور شہر کے سیاسی نمائندے بھی آپ کے مصافحہ کیلئے بڑھائے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر دیں ۔

۱۳ :۔ جب آپ اپنی مونچھیں بڑھالیں اور کوئی بھی آپ کی بڑی بڑی مونچھوں کی نوٹس نہ لے"

۱۴ :۔ جب آپکو کسی فارم پر ایسے دو معززین کے نام لکھنے ہوں کہ جو آپکو جانتے ہوں تو ایسے دو نام سوچنے پر بھی یاد نہ آئیں ۔

۱۵ :۔ جب شادی کے دس سال بعد بھی آپ کی بیوی کی چیٹھیاں اس کے والد بزرگوار کے نام کے ساتھ وصول ہوں ۔

۶ :۔ اور جب آپ اپنی نوکری کا استعفیٰ دیکر علیحدہ ہو جائیں تو نہ وہ جگہ

پر ہو اور نہ اس جگہ کے لئے کوئی اشتہار نکلے۔

۱۷:۔ جب آپ کو چائے دیتے ہوئے گھر والے آپ سے پوچھیں کہ کتنی شکر چاہیئے۔

۱۸:۔ جب آپ کسی دوست سے باتیں کرتے سڑک پر کھڑے ہوں تو فقیر آپ کے دوست سے دس پیسے کا سوال کرے اور آپ کی طرف بھیک کے لئے بھی ہاتھ نہ بڑھائے۔

۱۹:۔ جب آپ کسی دوست کے مدعو کرنے پر ہوٹل میں اس کے ساتھ کھانا کھائیں اور سارے آرڈر آپ کا دوست ہی دے مگر بیرا بل آپ کے سامنے لاکر رکھے۔

۲۰:۔ آپ کسی کتاب کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہوں اور کوئی قطع کلام کر کے پوچھے کہ آپ نے وہ کتاب پڑھی بھی ہے۔

ہمسایہ

تعالیٰ ایک ہاتھ سے نہیں بجتی اسی طرح جب تک دو ہستیاں آپس میں نہیں ملتی ہیں دوستی بھی نہیں ہو سکتی، کہتے تو ہیں محبت ہو جاتی ہے، کی نہیں جاتی، لیکن آج کل کے زمانے میں کیا نہیں ہوتا، دوستی کی بھی جاتی ہے، دوستی بنائی جاتی ہے، نبھائی جاتی ہے، دوستی کا دم بھرا جاتا ہے، ایثار اور قربانی سے کام لیا جاتا ہے۔ اور پھر غرض و غایت کے لئے دوستی کی نمائش بھی ہو سکتی ہے۔ اور تو اور دوستی خریدی بھی جا سکتی ہے۔ دوستی توڑی بھی جا سکتی ہے، کچھ ایسے جذباتی شاعر بھی گذرے ہیں کہ جن کے نزدیک بغیر دوستی اور محبت کے گذارا ممکن ہی نہیں کہتے ہیں ؎

حریف غم ہوں محبت نباہ لیتا ہوں
ملے نہ دوست تو دشمن کو چاہ لیتا ہوں

تو یہ دوستی کی ساری باتیں محض میل ملاپ سے شروع ہوتی ہیں، اب آپ ہی سوچئے کہ جگری دوست سے بھی زیادہ میل ملاپ اور ربط ضبط کس سے ہو سکتا ہے، جی ہاں وہ پڑوسی سے ہی ہو سکتا ہے کہ جس سے اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے آتے جاتے، مڈبھیڑ ضروری ہے، اس کا وجود ہی ہمہ وقتی ہوتا ہے، اور وہ سایہ کی طرح ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اسی لئے تو اس کے لئے ہمسایہ کا لفظ زیادہ ہی موزوں لگتا ہے۔ وہ تو ہمزاد، ہمدرد، ہمراز، ہمدم

ہمجنس، ہم پیالہ وہم نوالہ ہوتا ہے۔ اور جو ہمارے ساتھ رخت سفر باندھے تو ہم سفر اور اگر ایک ہی گھر کی دو لڑکیوں کے ساتھ ساتھ بیاہ ہو جائے تو ہم زلف سمجھئے، یہ ہمسایہ کہاں تک پہونچ سکتا ہے۔

مگر حقیقت احوال بیان کریں یہ ہماری اچھائیوں سے کم برائیوں سے زیادہ واقف ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو ہر حال میں رکھوالا سمجھتا ہے۔ انگلیاں اٹھا اٹھا کر عیب جوئی کرتا ہے۔ اور ہم کو محلے میں صورت نہ دکھانے کے موقف میں ڈال دیتا ہے۔ وقت بے وقت ہم سے قرض لینا، چیزیں مستعار لینا اور واپس نہ کرنا اس کا شعار ہے۔ ہمارے اچھے بھلے وفادار نوکر کو لالچ دلا کر ہم سے تڑا دینا، بچوں کی لڑائی میں اپنے ہی بچوں کی حمایت کرنا اور ہمارے بچوں کی شکایت کرنا اپنی گندی نالیوں کے پانی کا رخ ہمارے صحن کی طرف موڑ دینا یہ سب کچھ اس کا محبوب ترین مشغلہ ہوتا ہے، سایہ کیا پڑا کہ ہمسایہ ہو گیا، اسی لئے تو لوگ پناہ مانگتے ہیں کہ کہیں سایہ بھی نہ پڑے اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ پڑوسی کے حقوق بے حساب ہیں۔ اس کے فرائض اور ذمہ داریوں کا ذکر کہیں نہیں۔ اخلاقاً اور شرعاً جو ہو سو ہو، قانوناً بھی تو حق رکھتا ہے۔ ہم اپنی جائداد بیچنے کی سوچیں تو ہمارا پڑوسی اولین حق داری چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسی الجھن ہے کہ بالکل نہیں سوجھتا کہ اس کا حق بنا ہیں کہ اپنے منافع کی سوچیں، کون مدعی، کون مدعا الیہ؟ کس کا حق کس پر؟

پڑوسی سے زیادہ دل چسپ شخصیت پڑوسن کی ہوتی ہے کہ اس کو فرصت زیادہ ہی نصیب ہوتی ہے اور اس کا دل چسپ ترین مشغلہ یہی ہوتا ہے کہ کوئی

نہ کوئی شوشہ چھوڑ کر بلا اشتعال بنا محرکات لڑائی چھیڑ دے اس کے لئے نہ تو کسی خاص موڈ کی ضرورت ہے نہ موقع نہ محل کی اگر کوئی اس چھیڑ چھاڑ سے گریز کرنا بھی چاہے تو الٹا یہی کہ کس کی جوتی کو غرض پڑی ہے کہ لڑائی مول لیوے اور اسی جملہ ابتدائیہ سے انتہا تک معاملہ چل پڑتا ہے۔ اس وقت تک کہ جب تک گھر والوں کی واپسی کا وقت نہ ہو جائے۔ یا بچے مدرسوں سے بھو کے پیاسے لوٹ کر روٹی کے لئے ضد کرنا شروع نہ کر دیں۔

اس کے علاوہ بھی تو پڑوسن ایک مستقل آزار ہوتی ہے۔ بیوی کو زیور یا نیا کپڑا بنانا ہو تو پڑوسن کا حوالہ از بس کارگر ہوتا ہے۔ اس کے لئے مشین اس کے گھر کا اسٹوو ریڈیو ٹیلیویژن نئی موٹر غرض کہ ہر نئی چیز ایک بہانہ ہوتی ہے ایک محرک ہوتی ہے

ایکبار ہمارے پڑوسی نے شکایت کی کہ وہ محض اس لئے دیوالیہ ہوتے جارہے ہیں کہ ہماری برابری کے لئے ان کی بیگم دن رات نئی نئی فرمائشیں کرتی رہتی ہیں۔ اور اب ان کی تکمیل ان کے ضبط و امکان سے باہر ہوتی جارہی ہے۔ اس پر ہم نے اپنا سر پیٹ کر انھیں بتایا کہ ہم خود بھی اسی ٹالے دیوالیہ ہونے جارہے ہیں۔ اکثر تو ہم کو یہ بھی پتہ چلا ہے کہ پڑوسن اپنی ضرورت کی چیزوں کے لئے سیلز مین کو ہمارے گھر بھجواتی ہیں کہ وہ کسی طرح وہ ساری چیزیں ہم کو بیچ جائے کہ جو بعد میں حسب ضرورت اور موقعہ موقعہ سے ہم سے مستعار لے جاسکے۔ وہ تو یہ بھی کرتی ہیں کہ سیلز مین کو کچھ ایسی پٹی پڑھا کر بھیجتی ہیں کہ ذرا دیکھئے تو میں نے آپ کی پڑوسن کو کیسی عمدہ عمدہ چیزیں بیچی ہیں کیا آپ ان کو دیکھنا بھی پسند نہ کریں گی۔

ویسے بھی کہتے ہیں کہ پڑوسن وہ ہستی ہے کہ جس کو ہمارے گھر ہو پہنچنے کے لئے

پکھ ہی منٹ لگتے ہیں، لیکن خود اس کے گھر واپس جانے کے لئے گھنٹوں، یہ بھی مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت ہے کہ شادی کے فوراً بعد میاں کی باتیں بیوی سنتی ہے کچھ عرصہ بعد بیوی باتیں کرتی ہے، میاں سنتا ہے، لیکن بالآخر میاں بیوی دونوں ہی باتیں کرتے ہیں اور سنتے ہیں پڑوسی!

اس لئے تو ہم متفق الرائے ہیں کہ قابل بھروسہ پڑوسی میسر ہونا ایک بہت بڑی نعمت ہے لیکن ایسا پڑوسی کہ جو ہم پر پورا پورا بھروسہ کرے اس سے کہیں زیادہ بڑی نعمت ہے. ہم جب کبھی کسی مشکل میں پھنسے ہیں تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے پڑوسی صد فیصد ہمارے ساتھ ہیں بنصیحت یا لعنت ملامت کیلئے!

ان ہی سب باتوں کے تجربوں سے ہم نے یہ پالیسی بنالی ہے کہ پڑوسی کو بہت سوچ سمجھ کر ہی مشورہ دیتے ہیں کہ جو ہم یقین سے جانتے ہیں کہ وہ قبول نہیں کریں گے. اور جب نہ مان کر وہ نقصان اٹھاتا ہے تو ہم یہ اس کو جتاتے ہیں کہ "دیکھا ہماری بات نہ ماننے کا نتیجہ"۔ اور وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر ہم کو شرمساری سے یہ سننا پڑتا ہے کہ ہماری بات کتنی غلط تھی.

پڑوسی آدمی ہی نہیں، مملکتیں بھی اسی چکر میں ہیں. کبھی سرحدی تنازعے کبھی تجارتی معاہدوں کی خلاف ورزیاں ہیں، کبھی دریاؤں کے پانی کے جھگڑے ہیں. کبھی ادھر کے ناپسندیدہ لوگ ادھر آرہے ہیں، پڑوسیوں کی دوستی نباہنا وبال جان ہوا جاتا ہے اور ہر بار یہی خیال ہوتا ہے کہ اس سے تو بھلا یہی ہوتا کہ سرے سے پڑوسی ہی نہ ہو، اور جو کوئی ہو بھی تو اس سے دوستی تو کجا صاحب سلامت بھی نہ ہو، اسی لئے اب بڑے بڑے شہروں میں گھر ہی ایسے بننے

لگے ہیں کہ کون کس کا پڑوسی، صرف آزو بازو گھر ہوں تو ضرور پڑوسی کا رشتہ قائم ہو جائے گا۔ لیکن اب تو ادھر بھی گھر ہے، نیچے قدموں تلے بھی، دائیں بھی بائیں بھی، اب بتائیے کہ کون کس کا پڑوسی، کس کا سایہ کس کے اوپر اور جہاں سورج کی روشنی کا گذر ہی نہ ہو تو وہاں سایہ کہاں اور ہمسایہ کون ؟

جی چاہتا ہے کہ اپنے پڑوسی سے کہیں ؎

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
نہ میں تم سے کوئی امید رکھوں دل نوازی کی
نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے

اور پھر ان کو بتادوں

تعارف روگ ہو جائے تو اس کو بھولنا بہتر
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا

اور جو اس قسم کے اعلان اور اس پیش کش سے کام نہ بنے تو پھر حضرت غالب کی طرح یہ تصفیہ قطعی طور پر کرنا ہی ہوگا کہ ؎

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

اور جو ایسی کوئی جگہ مل جائے تو اس انداز سے رہنا چاہیئے کہ ؎

بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑوسی اور محلہ داری سے تو ہم بھاگنے کی سوچتے ہیں لیکن حضرت غالب

نے تو شاید اپنی ساری مصیبتوں کے مارے یہ بھی تصفیہ کیا تھا کہ وہ جگہ ایسی ہونی چاہیئے کہ ؎

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

بیزارگی اور پریشانی کی یہ انتہا کوئی سو برس پہلے کی بات ہے. جب کہ آبادی اتنی گھنی اور گنجان نہ تھی، وسیع صحن والی کوٹھیاں اور حویلیاں ہوا کرتی تھیں، گھروں کے بیچ بیچ کافی کھلی جگہ ہوا کرتی تھی، اور اب اس کے مقابلے میں سوچیئے بھی تو ایسا کوئی رخ نہیں کہ جہاں پڑوسی نہ ہو اور جو پڑوسی ہو تو اس سے میل ملاپ ناگزیر اور اس کی دوستی بے انتہا پریشانیوں کا باعث قدم قدم پر پچھتاوا، آئے دن کی کرکری شاید پڑوسی کے ڈر سے ہی یہ محاورہ گڑھا گیا تھا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اسی لئے اور سب پریشانیوں سے بڑھ چڑھ کر یہ پریشانی کہ کہیں ہمارے پڑوسی ہماری یہ ساری باتیں نہ سن رہے ہوں۔

مَردوں کی دُنیا

کیا یہ صرف مردوں کی دنیا ہے؟ اس دنیا میں بسنے والوں کی گنتی ہوتی ہے تو اس کو مردم شماری کہتے ہیں۔ کیا عورتوں کو نہیں گنا جاتا؟ یا وہ کسی شمار وقطار میں نہیں؟۔ کسی کی بہادری اور طاقت کی تعریف کرنا ہو تو اس کی مردانگی کو سراہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اس نے مردانگی دکھائی۔ وہ مردِ میدان نکلا۔ محاورہ بھی یہی بن گیا ہے کہ "ہمتِ مرداں مدد خدا" جیسے خدا صرف مردوں کا ہے اور انہیں کی مدد کرتا ہے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر، اوتار، سنت سادھو، رشی مہنت سب ہی تو مرد ہیں کبھی کسی عورت کو ایسا درجہ نصیب نہیں ہوا۔ کوئی شیخی بگھارتا ہے تو اپنے باپ دادا کے تعلق سے ڈینگیں مارتا ہے اور "پدرم سلطان بود" کہتا ہے "مادرمن ملکہ بود" کیوں نہیں کہتا؟۔ کوئی اچھا کام کرتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس نے باپ دادا کا نام روشن کیا۔ ماں باپ کا نام نہیں لیا جاتا۔ حسب نسب باپ کی طرف سے دیکھا جاتا ہے۔ برہمن کا پوت برہمن، سید کا بیٹا سید، پٹھان کی اولاد پٹھان۔ شادی ہونے پر عورت اپنا نام شوہر کے ساتھ جوڑتی ہے۔ بیٹا باپ کے نام پر چلتا ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہادِ زندگی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

تو کیا سچ مچ یہ مردوں ہی کی دنیا ہے؟ ہر چیز کے کرتا دھرتا وہی ہیں۔ اس دنیا میں عورت کا کیا مقام ہے وہ محض عورت ہے۔ تو کچھ بھی نہیں۔ کسی کی بیوی بنتی ہے تو البتہ نصف بہتر BETTER HALF کہلاتی ہے اور اس کو گھر والی کا خطاب دے کر اس کا وجود بھلا دیا جاتا ہے۔ ہندی میں مرد پتی ہوتا ہے اور بس ہر بات اور ہر کام میں مرد ہی پتی ہوتا ہے۔ وہ مالدار ہے تو لکھ پتی کروڑ پتی۔ مملکت کا صدر ہے تو راشٹر پتی۔ فوج کا سپہ سالار ہے تو سینا پتی، یونیورسٹی کا چانسلر ہے تو کُل پتی۔ صاحب علم ہے تو وِدیا پتی، صدر نشین ہے تو سبھا پتی۔ ہر جگہ پتی کا بول بالا ہے۔ بے چاری پتنی بھی تو کہیں سانس لے رہی ہے اس کا نام سرے سے کیوں بھلا دیا جاتا ہے۔

عورت کے فرائض میں پتی وَرتا ہے، لیکن کسی پتی کو "پتنی وَرتا" کا حکم نہیں دیا جاتا۔ اور جو کبھی کوئی مرد اپنی بیوی کو عزت و احترام سے رکھتا ہے تو اس کو زن مُرید کا خطاب دیا جاتا ہے یا وہ جورو کا غلام کہلاتا ہے اس کی کھلے بندوں کھِلّی اڑائی جاتی ہے اور اس کا مذاق ہی نہیں اڑایا جاتا بلکہ وہ ہدف ملامت بن جاتا ہے۔

ہماری حکومت کسی کو نوازتی ہے تو چاہے مرد ہو کہ عورت پدم شری کا خطاب عطا کرتی ہے۔ اس موقع پر بھی شری متی کو کوئی یاد نہیں کرتا۔ مندر کی دیوی کو بھی بہت زیادہ عزت و احترام دینا مقصود ہو تو شری ہی سے نوازا جاتا ہے، جیسے شری تلجا بھوانی۔

کسی ملک یا خطے کے کارگزاروں کا حساب کیا جاتا ہے تو MAN POWER کہتے ہیں، حالانکہ اس میں عورتوں کی کارکردگی بھی محسوب ہوتی ہے، لیکن عورت کا نام لینا شاید معیوب لگتا ہے۔ بہت سارے ملک فادر لینڈ ہیں۔ بہت کم مدر لینڈ، زبان

کی حد تک ضرور مادری زبان مانی جاتی ہے۔ مگر بس صرف اِسی حد تک۔

کسی مرد کو برا کہنا ہو تو اس کی ماں بہن کو گالی دی جاتی ہے اس کو تکلیف ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ماں کا دودھ یاد آگیا۔ اس کے برخلاف ساری معیوب باتیں عورتوں سے منسوب کیجاتی ہیں کسی کے کردار پر دھبہ لگانا ہو تو لٹھ سے بازاری عورت کہیں گے، کسی مرد میں کمزوری ہو تو اس کو نسوانیت سے تعبیر کریں گے، کہیں گے زنانہ پن پایا جاتا ہے۔ عورت کی طرح ناقص العقل ہے عورت کی تضحیک کرنا ہو تو اس کو مرد کے پیر کی جوتی غرض کہ طرح طرح سے صنفِ لطیف کو کثیف بنادیا جاتا ہے۔ اس کے خلاف مرد کے لئے کوئی گالی ہے، نہ اس کا کردار برا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی خصوصیت قابل ملامت۔

قدرت نے بھی تو عورت پر ہزار ظلم کئے ہیں۔ مرد کے سارے عیب اور تمام گناہ چھپ جاتے ہیں بلکہ میٹ جاتے ہیں لیکن عورت کے قدم ڈگمگائے کہ اس کا پردہ بری طرح فاش ہو جاتا ہے۔ اس کا گنہ معاف بھی نہیں کیا جاتا۔

بے شک ایک مختصر سے دور میں عورت کے حسن و شباب کی تعریفیں ہوتی ہیں، قصیدے گائے جاتے ہیں اس کے سامنے سجدے کئے جاتے ہیں، رقیبوں سے لڑائیاں مول لی جاتی ہیں۔ اپنی جان کی قربانی کی پیش کش کی جاتی ہے لیکن جہاں وہ قابو میں آگئی کہ اس کو بیوی بنا کر گھر کی چار دیواری میں قید کر دیا جاتا ہے گھر گرہستی میں الجھا دیا جاتا ہے۔ بچوں کی پیدائش اور پرورش سے اس کو سنبھلنے نہیں دیا جاتا۔ اس کا حسن اس کی جوانی اس کا نکھار سب دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔

بے شک مرد محنت کرتا ہے، روزی کماتا ہے اور شاید اسی لئے ہر بات

کا سہرا اپنے سر باندھ لیتا ہے، لیکن دنیا میں کیا یہ نہیں ہوتا کہ فوج سر کٹاتی ہے تو سپہ سالار کا نام ہوتا ہے، ہل مزدور پسینہ ٹپکاتے ہیں تو منافع مالک کو ہوتا ہے لہٰذا صرف محنت مزدوری کرنے والے مرد کے اوپر عورت کا درجہ ہونا چاہیئے۔

تمام دنیا کی عورتیں "سیون پرو ون" سے اپنی آنکھیں پھوڑتی ہیں۔ اور نازک سے نازک کام کر دکھاتی ہیں لیکن جہاں کہیں ٹیلرنگ فرم کھلے تو مرد ہی ٹیلر ماسٹر ہوتا ہے۔ گھروں میں دن رات چولہے، چکّی میں عورت مصروف رہتی ہے۔ گھر والوں کو مزے مزے کے کھانے تیار کر کے کھلاتی ہے، لیکن بھٹیار خانہ ہو کہ ہوٹل مرد ہی کام پر لگائے جاتے ہیں اور بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟

عورت بچوں کو جنم دیتی ہے، دودھ پلاتی ہے، پالتی پوستی ہے، لیکن وراثت، نام، جائداد، دولت، سب کا حصّہ باپ کی طرف سے لڑکے کو ملتا ہے۔ عورت کا کہیں نام ونشان بھی نہیں ہوتا۔ اسی لئے تو تمام عمر باپ کی خوشامد ہوتی ہے۔ ویسے کہنے کو تو

The hands that Rock the cradle Rule the world.

محاورہ ہے کہ جو ہاتھ (یعنی عورت کے ہاتھ) جھولا جھلاتے ہیں وہی دنیا پر حکمرانی کرتے ہیں۔ مگر بتایئے تو جھولا جھولنے کی عمر کے بعد ان ہاتھوں کا دست نگر کون رہتا ہے؟

کہنے کو تو ماں کے پیر کے نیچے جنت ہے لیکن اس روندی ہوئی کچلی ہوئی جنت کو کون مانتا ہے۔ جس اولاد کو ماں پال پوس کر بڑا کرتی ہے اس کو نور چشم، لخت جگر بنا کر رکھتی ہے، وہی اولاد ۲۰/۲۵ سال کے بعد یا تو اپنی بیوی یا اپنے شوہر کے ساتھ منسلک ہو کر ایسی غائب ہو جاتی ہے کہ ماں اس کو یاد کرتی ہی رہ جاتی ہے۔ اور پھر وہ پیر کے نیچے کی جنت

کسی کو یاد نہیں آتی۔

اور تو اور شاعری بھی مردوں ہی زبان میں ہوتی ہے، حتیٰ کہ عورتیں بھی اسی لب ولہجہ میں بولتی ہیں اور تخلص بھی ایسے اختیار کرتی ہیں کہ جس سے ان کے صنف نازک ہونے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ کسی زمانے میں کچھ دنوں کے لئے اردو زبان میں ریختی کا دور چلا تھا لیکن آج وہ اندازِ کلام نیست و نابود ہو چکا ہے۔ یا تو وہ زمانہ تھا کہ مرد شاعر بھی زنانہ قسم کے تخلص رکھا کرتے اور ریختی یعنی بیگماتی زبان میں بصد افتخار شاعری کیا کرتے۔ انشار، مصحفی، رسوا، میر جیسے اساتذہ نے بھی اس رنگ میں خوب خوب گل کھلائے ہیں۔

علی بیگ دہلوی نازنین تخلص کیا کرتے تھے۔

گیا جب سے یار اور حرمت ہی کھوئی   نہیں نازنین رنج کرتی کسی کا
اگر میں نے کنبے کی عزت ڈبوئی   بلا سے رکھوں شاد دل کو تو اپنے

امجد علی خاں عصمت کہتے ہیں

جو کمسنی میں دیکھ چکی منہ ہزار کے
بیٹھے گی کب بھروسے پہ وہ ایک یار کے
تیری خاطر میں گھر سے دن دہاڑے آتی ہوں ورنہ
کسی نے آج تک آنچل نہیں دیکھا ہے عصمت کا

میر یار علی المتخلص جان صاحب نے تو ریختی گوئی کے سوا اور کسی رنگ میں شاعری کی ہی نہیں۔ وہ مشاعروں میں بھی زنانہ لباس پہن کر جاتے اور مشاعرہ لوٹ لیتے۔

ہوں میں بڑھیا پہ جوانوں کے گلے کاٹتی ہوں

اب بھی یہ کند چھری ہے مرے دو چار سے تیز
میں گری تو بھی گرا، پاؤں نہ تیرا ٹوٹا
تیرے دل کو تو کل آئی مرا پہونچا ٹوٹا

کہتے ہیں انشاء کو نواب سے کوئی ضروری کام تھا، لیکن نواب نے روزہ رکھا ہوا تھا اور یہ حکم دے دیا تھا کہ کوئی مخل نہ ہو۔ انشاء نے عورتوں کے کپڑے پہن لیے اور چھم چھم کرتے خلوت میں گھس گئے۔ ناک پر انگلی رکھی اور نواب سے مخاطب ہو کر کہا۔

میں تو کہتی تھی نہ رکھ اے مرے پیارے روزہ
بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

ملاحظہ فرمائیے کیا شیرینی، کیسی لطافت، کس قدر حلاوت ہے اس انداز بیان میں، اور یہ فخر اردو زبان ہی کو حاصل ہے کہ اس نے عورتوں کو بھی اس قدر پیاری زبان دی اور ان کی انفرادیت میں چار چاند لگا دیئے۔ ان کے حسن تکلم کو ایک اندازِ دل ربائی دیا لیکن اس کو سب ہی نے بھلا دیا۔

اب عورتیں مردانہ وار (معاف کیجیے ہمارے قلم سے بھی بے ساختہ یہ جملہ نکل پڑا، مقابلے پر اتر آئی ہیں، اور مرد میدان (پھر غلطی ہوگئی) بن کر اپنی صلاحیتوں کے بل بوتہ پر برابری کا دعویٰ کر رہی ہیں اور کہتی ہیں کہ وہ بھی MAN POWER رکھتی ہیں۔ اب اسے کیا کہیے کہ ان کی زبان پر بھی مرد ہی کا نام آتا ہے۔

سنا کہ کسی محفل میں مقرر عورتیں اپنی کارکردگی کی روداد سنا کر یہ ثابت

کرنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ آج کی عورت کسی طرح بھی مرد سے کمتر نہیں ہے۔ ٹیپ کا بند یہ تھا کہ اب عورت اور مرد میں بہت ہی تھوڑا فرق رہ گیا ہے۔ حاضرین میں سے کسی دل جلے مرد نے چلّایا۔ "تھوڑا سا فرق زندہ باد"

فنونِ لطیفہ اور ظرافت

خوش مذاقی لطافت وظرافت طنز ومزاح بذلہ سنجی یہ سب لطیفہ گوئی یا چٹکلہ بازی سے پھلتے پھولتے ہیں لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ لطیفہ کو فن مانا گیا ہے اور نہ ہی فنونِ لطیفہ میں اس کو جائز مقام دیا گیا ہے۔ حالانکہ ڈرامہ ناٹک رقص، ناچ مصوری فنِ تعمیر و سجاوٹ وزیبائش، نقاشی، سنگ تراشی بت سازی آنکھوں کو سرور بخشتے ہیں موسیقی اور لوک گیت کانوں میں مٹھاس گھولتے اور مدھرتا سے نشہ چڑھاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر فنون لطیفہ انسان کی جملہ حسّوں کو تازگی بخشتے ہیں اور اس کی بالیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ لطیفے و چٹکلے اعصابی تناؤ اور کھچاوٹ کو دور کرتے ہیں اور اعصابی نظام کو تر و تازہ کرتے ہیں۔ ہنسی سے اضمحلال تھکاوٹ، پستی، جھنجھلاہٹ، غصہ، قنوطیت یہ سب آن کی آن میں دور ہو جاتے ہیں۔

ویسے تو ہنسنے ہنسانے کی باتیں ہر وقت ہوتی رہتی ہیں لیکن جب انسان اپنی حس کو سست کر دیتا ہے تو ہنسی کے سارے محرکات ضائع ہو جاتے ہیں اور باوجود کوشش کے دل خوش کن اور خوش مذاقی کی باتیں بھی ہنسنے پر اکسانے سے قاصر رہ جاتی ہیں۔

بیشتر دیکھا گیا ہے کہ جب ساری محفل ہنستی ہے تو بعض لوگ اس کھوج میں مصروف پائے جاتے ہیں کہ آخر اس ہنسی کا کیا کارن ہے؟ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی سمجھ بوجھ پراگندہ ہے۔ ورنہ جب لوگ اچھے موڈ میں ہوتے ہیں تو ان کا رُوم رُوم بات بات پر جھوم اٹھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ مزاح کی حس پر منحصر ہوتا ہے اور اس امر کی دلیل ہوتا ہے کہ ان میں شئے لطیف کی کمی نہیں۔ یہی وہ خصوصیات اور انسانی کردار کے لوازمات ہیں کہ جن سے انسان اپنی زندگی سنوارتا ہے، اس کو خوشگوار بنا سکتا ہے اور چھوٹی چھوٹی الجھنوں سے بچ جاتا ہے

مزاح کی یہی حس ہے جو انسان کے دکھ درد کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتی ہے اور آنکھوں میں آنسو کے بجائے ہونٹوں پر مسکراہٹ بخشتی ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ جب وہ سیاسی جیل میں تھے شیرش آسن پر پابندی سے عمل کرتے تھے اور سر کے بل کھڑے ہو کر خون کے دوران کو سر کی طرف دوڑاتے تھے۔ طبعی طور پر اس کا جو کچھ فائدہ ہوا ہو لیکن ان کا کہنا ہے کہ اس حرکت سے ان کو جو خاص لطف حاصل ہوتا تھا وہ مضحک صورت حال کی وجہ سے۔ چنانچہ ان کی مزاح کی حس تیز ہو جاتی تھی اور تکلیف دہ ماحول بھی ان کے لئے قابلِ برداشت ہو جاتا تھا۔

رابرٹ برنز نے اپنی ایک نظم میں دعا مانگی ہے۔ "اے خدا ہمیں ایسی قوت عطا فرما کہ جس وجہ سے ہم اپنے آپ کو اس حال میں دیکھ سکیں کہ جس میں لوگ ہمیں دیکھتے ہیں" بالفاظ دیگر یہی قوت ہم کو اپنے آپ پر ہنسنے کا سہارا دیتی ہے اور ہم خود برداشتہ

مزاح اور ظرافت کا لطف اٹھا سکتے ہیں زندگی کے نشیب و فراز، ہم آہنگی کے فقدان یا تضاد کو اس کی صحیح جہت میں دیکھ سکتے ہیں۔ جسمانی اذیت میں بھی ہنس کھ رہ سکتے ہیں جیسے کہ ایک فوجی سپاہی کو اس الزام کی پاداش میں کہ وہ بلا اجازت بیرکس کے باہر گیا تھا جسمانی سزا دی جارہی تھی اور وہ مسلسل قہقہے مار کر ہنس رہا تھا بالآخر جب اس سے وجہ پوچھی گئی تو اسنے بتایا کہ وہ اپنی ہنسی پر اس لئے قابو نہیں پا سکتا کہ قصوروار کوئی اور تھا اور اس کو غلط فہمی کی بنا پر سزا دی جارہی ہے۔ یہ بھی ایک زبردست ستم ظریفی ہے۔

انسان کے جذبات تاثرات احساسات اور خیالات کے اظہار کا ذریعہ فنون لطیفہ ہیں ان میں سے کسی نہ کسی کا آسرا لئے بنا وہ اپنے لطیف جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا ان کے بغیر نہ اپنے غم کو دبا سکتا ہے نہ اپنی خوشی کو اچھال سکتا ہے۔

فنون لطیفہ میں موسیقی کا درجہ سب سے افضل و برتر ہے اور اسی لئے موسیقی کی محفلوں میں موج تبسم، دریائے لطافت، بحر ظرافت یہ سب مل جاتے ہیں بشرطیکہ آدمی کا مزاج اور موڈ ایسا ہو کہ ان کو قبول کرے۔

کل ہی کی بات ہے کہ کسی محفل میں ایک خاتون بہت لہک لہک کر گا رہی تھیں حاضرین میں سے کسی نے بیزارگی سے کہا "کیا بھونڈی اور کرخت آواز ہے کون ہیں یہ خاتون؟" پاس ہی بیٹھے ہوئے مہمان نے برافروختہ ہو کر کہا "جناب وہ تو میری بیوی ہیں" ریمارک کرنے والے صاحب بہت سٹپٹائے اور بولے "ارے توبہ، معافی چاہتا ہوں شاید وہ گیت ہی بے ڈھب ہے۔ نہ جانے کس جاہل مطلق نے لکھا ہے۔" جھینپ

مٹانے کو تو یہ کہہ دیا لیکن ان کو مزید خفت اٹھانی پڑی اور کچھ کہتے نہ بن پڑا جب ان کو بتایا گیا" جی وہ گیت تو میں نے لکھا ہے۔"

ایک جوشیلا نوجوان فن کار اسٹیج پر گا رہا تھا۔ اسنے غزل ختم کی اور داد طلب نظروں سے سامعین کو دیکھا تو پورا ہال گونج اٹھا دوبارہ سنائیے دوبارہ سنائیے کے نعروں سے۔ یہ بڑے خوش خوش دوبارہ سنانے لگے اور ختم پر اسی طرح کا شور مچا" پھر سے سنائیے، پھر سے سنائیے" اپنی تعریف کے خیال میں مگن اسی غزل کو اسی انداز سے دھرایا۔ اس طرح پانچ چھ مرتبہ فرمائش پر فرمائش ہوتی رہی اور یہ سنا سنا کر تھک گئے۔ حلق خشک ہونے لگا اور آواز بھی بیٹھ گئی معافی چاہتے ہوئے فن کار نے کہا" اب کسی اور موقعہ پر ضرور سناؤں گا" حاضرین چلا اٹھے" ہم تم کو اسوقت تک جانے نہیں دیں گے کہ جب تک تم اس غزل کو ٹھیک لے اور تال میں صحیح تلفظ کے ساتھ نہیں گاؤ گے۔"

اعلیٰ سوسائٹی کی ایک خاتون نے اپنے مہمانوں کی خاطر ڈنر کے بعد غالبؔ کی مشہور غزل" دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے۔" گا کر سنایا ایک بزرگ صورت بڑے غور سے گانا سن رہے تھے یکایک رونے لگے، خاتون نے گانا ختم کر کے خوشی خوشی پوچھا" آپ غالبؔ کے شیدائی معلوم ہوتے ہیں۔" یہ بزرگ بہت ہی مغموم آواز میں بولے" جی نہیں۔ میں میوزک ٹیچر ہوں۔"

اپنے لڑکے کو ستار سکھانے کے لئے استاد رکھا تھا لیکن صاحبزادے ایسے کند ذہن تھے کہ مہینوں کے ریاض کے بعد بھی ستار سے بے انتہا کرخت اور بھونڈی آوازیں ہی نکالا کرتے۔ والدین تنگ آ کر استاد کو منع کرنے والے تھے کہ استاد جی نے

بتایا "آپ کا لڑکا پہلے سے اب ستار بہت اچھا بجانے لگا ہے"؟ باپ نے یقین نہ کرتے ہوئے کہا "سچ؟ کہیں آپ کے کان اس کے بے سُرے پن کے عادی تو نہیں ہو چلے"

ایک نوجوان لڑکی نے مشہور موسیقار سے دریافت کیا کہ اس کو جو فن موسیقی میں مہارت تامہ حاصل ہوئی ہے کیا وہ اپنے باپ دادا سے ورثہ میں ملی ہے؟ موسیقار نے کہا "ایسا ہو سکتا ہے لیکن بہت کم، اب دیکھیے آپ نے سہگل کا نام تو سُنا ہے لیکن ان کے والد کا نام کبھی نہ سنا ہوگا" لڑکی نے کہا "جی نہیں ان کے باپ کا نام سنا ہے نہ خود سہگل کا"۔

ایک پہلوان کشتی میں ہار کر اپنا دل بہلانے کو لہک لہک کر گا رہے تھے کسی نے ان کا گانا سن کر کہا "اس بھلے آدمی کو کس نے کہا کہ وہ گا سکتا ہے"۔ دوسرے نے کہا "کس کی شامت آئی ہے جو اس سے کہے کہ وہ گا نہیں سکتا پہلوان جو ٹھہرا"۔

کہتے ہیں کہ موسیقی کی تانیں ہر گھر میں گونجنا ہی چاہیے لیکن اصل میں ایک استثناء ضروری ہے وہ یہ کہ پڑوسی کے گھر سے نہیں گونجنا چاہیے۔

سنا ہے ایک پولیس انسپکٹر نے دروازہ کھٹ کھٹا کر گھر کے اندر کے شور کی وجہ سے چیخ چیخ کر صاحب خانہ سے کہا۔ دیکھئے جناب آپ کو قانون اور پولس سے پورا پورا تعاون کرنا ہوگا اور سچ سچ بتانا ہوگا کہ آپ کے مکان میں کیا واردات ہو رہی ہے" مالک مکان نے حیرت اور پریشانی سے پوچھا "کیا مطلب آپ کا؟" انسپکٹر نے کہا "ہمیں آپ کے پڑوسیوں نے فون پر بتایا ہے کہ آپ کے گھر کے اندر تان سین کا قتل ہو رہا ہے۔ اسی لئے پولس کے کمشنر صاحب نے بطور خاص حکم دیا ہے کہ

اس بات کی پوری پوری تحقیقات کریں۔

پڑوسی نے شکایت کی "آپ اپنا کتا کہیں دور بھجوا دیجئے کل جب میری لڑکی گا رہی تھی تو وہ بہت بھونکتا تھا" لڑکی کے والد نے جواب دیا "مگر شروعات تو آپ کی لڑکی نے کی تھی۔"

شوہر سے بیوی نے بڑے پیار سے پوچھا کہ جب وہ گانا گاتی ہے تو یہ باہر وراندے میں جاکر کیوں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا انہیں اس کا گانا دور سے زیادہ اچھا لگتا ہے؟ شوہر نے جواب دیا بات دراصل یہ ہے کہ تم جب اندر گانا گاتی ہو تو میں یہ چاہتا ہوں کہ پڑوس والے مجھے باہر دیکھ لیں اور ان کا گمان کسی اور بات پر نہ جائے۔

لڑکی نے ماں باپ سے کہا کہ وہ گانا سیکھنے جا رہی ہے تو نہ صرف ماں باپ بلکہ پڑوسیوں نے بھی یک زباں ہو کر کہا "ضرور ضرور گانا سیکھنے ضرور جاؤ اور جتنی دور ہو سکے اتنی دور جاؤ۔"

شوہر اپنی بیوی کے گانے کی تعریف میں رطب اللسان تھے اور کہہ رہے تھے کہ اس کو بہت شوق ہے دن رات گایا کرتی تھی مگر جب سے بچے آگئے ہیں اس کو گانے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ دوستوں نے کہا "سچ ہے بچے سکون وراحت کا سامان ہوتے ہیں۔"

ایک اور صاحب بڑے فخر سے سنا رہے تھے کہ میری لڑکی نے جب سے گانا شروع کیا ہے میری قسمت جاگ اٹھی ہے۔ پوچھا کہ کیا اس کو فلموں میں پلے بیک گانے مل گئے ہیں تو بولے "جی نہیں۔ جب سے اس نے گانا شروع کیا ہے اڑوس

پڑوس کے سب ہی لوگ اپنے اپنے گھر آدھی قیمت میں مجھے بیچ کر کہیں دور چلے گئے ہیں۔"

شعر و نغمہ کی محفل جمی تھی۔ مغنی نے میزبان سے کہا ہم نے سنا ہے آپ موسیقی کے دلدادہ بھی ہیں اور جانکاری بھی رکھتے ہیں" میزبان نے کہا" ہاں ہاں مگر کوئی مضائقہ نہیں آپ اپنا گانا جاری رکھیئے۔"

بیوی نے اپنے شوہر سے کہا" میں چاہتی ہوں کہ کل کی اپنی ڈنر پارٹی میں مہمان خوب کھل کر بے تکلفی سے باتیں کریں۔ شوہر نے تجویز پیش کی" تو پھر کسی گانے والے کا انتظام کریں۔"

موسیقی کا پروگرام چل رہا تھا اور دو آدمی بیٹھے خوب ٹرٹر کر رہے تھے۔ پیچھے سے کسی نے کہا" کیا مصیبت کر رکھی ہے۔" باتونی آدمی نے پلٹ کر پوچھا" کیا آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے؟" جواب دیا" بالکل نہیں میں تو اس گانے والے کی شکایت کر رہا تھا جو آپ کی باتوں میں ہرج پیدا کر رہا ہے۔"

شہنائی بج رہی تھی اس کو سن کر ایک صاحب پھڑک اٹھے اور اپنے ساتھی سے کہا کہ کیا خوب شہنائی بج رہی ہے۔" ساتھی نے پوچھا کچھ کہا آپ نے مجھ سے؟ یہ اپنی تعریف دہرائیے" شہنائی کیا خوب بج رہی ہے۔" ساتھی کو پھر بھی سنائی نہ دیا پلٹ کر پھر پوچھا اور وہی جواب ملا جس کو یہ پھر بھی سن نہ سکے تو کہا ارے یہ شہنائی ایسی بے ڈھب بج رہی ہے کہ کان کے پردے پھٹے جا رہے ہیں میں تو کچھ نہیں سن پاتا"

موسیقی کی محفل میں سامعین میں سے کسی نے کہا" ارے یہ تو بڑا مقبول عام اور چلتا ہوا گانا ہے۔ برابر والے نے سن کر کہا" ہاں تھا تو سہی مگر ان کے گانے سے پہلے"

موسیقار بہت ہی مدھر سروں میں گا کر اپنا پروگرام ختم کرنے کو تھا کہ کسی نے فرمائش کی بھیرویں سنائیے" موسیقار نے ادباً کہا ابھی ابھی تو بھیرویں ہی گایا ہے۔ یہ بولے "اگر بھیرویں تھی تو خوب تھی۔"

ناچ اور نرتیہ ایسی کلا ہے کہ جس سے خاص و عام سب ہی لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن جب اناڑی اور غلط فن کار سامنے آتا ہے تو تعریف رہی ایک طرف برداشت کی بھی قوت نہیں رہتی۔ چنانچہ ایسے ہی ایک آرٹسٹ کا ناچ ختم ہونے پر اس سے کہا گیا "آپ ہر لحاظ سے ہندوستان کی بہترین کلاکار ہو سکتی ہیں لیکن دو چیزوں کی وجہ سے آپ رہ گئیں"۔ آرٹسٹ نے امید و بیم سے پوچھا "وہ کیا دو چیزیں ہیں؟" بتایا "آپ اپنے دو پیروں کی وجہ سے رہ گئیں۔"

کسی اور موقع پر ایسے ہی اوٹ پٹانگ پروگرام دیکھ کر ایک شخص نے کہا "نہ معلوم کس استاد سے اس نے سبق لئے ہیں، دوسرے صاحب نے فرمایا "لگتا ہے اس نے سبق تو لیے ہیں مگر ڈانس ماسٹر سے نہیں، کشتی کے استاد سے۔"

اپنے احساس کمتری کو چھپانے کے لئے ڈانسر نے بطور انکساری کہا "پتہ نہیں کیا بات ہے کہ اس سے پہلے میں نے اتنا خراب کبھی نہیں ناچا۔ سننے والے نے کہا تو آپ کا مطلب ہے اس سے قبل بھی آپ ناچ چکے ہیں؟"

سنگ تراشی اور بت سازی کے تعلق سے مائیکل اینجلو کا کہنا ہے کہ جتنا سنگ مرمر ضائع ہو گا اتنا ہی مجسمہ شاندار بنے گا" نقاشی، مجسمہ سازی اور آرکی ٹکچر کو منجمد موسیقی یا Petrified music اس لیے کہا گیا ہے جو تانیں دل و

دماغ پر حسین تاثرات چھوڑ کر ہوا کی لہروں میں فنا ہو جاتی ہیں وہ دیرپا نقوش کی شکل میں مجسموں یا خوبصورت عمارتوں میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔

آج کل کا تجریدی آرٹ (ABSTRACT ART) یا ماڈرن آرٹ بھی خوب ہے کچھ لکیریں اِدھر کھینچ دیجئے کچھ اُدھر۔ کالے رنگ کا برش پھرا دیجئے۔ لال رنگ کو اس کے برابر میں لگا دیجئے نیلگوں رنگ کہیں کہیں دھبوں اور چھینٹوں کے روپ میں بھر دیجئے بس فن مصوری کا شاہ کار تیار ہے۔ جی چاہے تو اس کو سیدھا لٹکا دیجئے یا الٹا۔ ٹیڑھا ترچھا بھی لگ سکتا ہے کسی طرف سے کسی طرح بھی۔ بہر کیف یہ مصوری کا اعلےٰ نمونہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مصور نے بہت احتجاج کیا کہ اس کی بنائی ہوئی تصویر کو مقابلہ کی نمائش میں الٹا لٹکا یا گیا ہے پر ججوں کی کمیٹی نے اس کی ایک نہ مانی اور اس کو مصور کے حساب سے الٹا ہی ٹنگا کر پہلے انعام کا مستحق قرار دیا۔ یہ بات اوروں کی سوجھ بوجھ سے بالاتر تھی۔

ہم کو بھی بچپن میں ڈرائنگ کا بہت شوق تھا اور ہماری عین خواہش تھی کہ مصوّری میں دسترس حاصل کریں لیکن بزرگوں نے تنبیہہ کی کہ اگر جاندار کی تصویر بناؤ گے تو قیامت کے دن ان تصویروں میں جان بھرنا ہوگا۔ ہم نے اس ڈر کے مارے مصوری کا خیال ہی ترک کر دیا۔ یہ کیا پتہ تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ کچھ خطوط ٹیڑھے میڑھے لگا دو، دو ایک گڑھے اور دائرے بنا دو عورت کی تصویر بن گئی کسی بھی جاندار سے دور کی مشابہت نہیں تو پھر اس میں جان بھرنے کا کیا سوال۔

تجریدی آرٹ میں چھپے ہوئے مردوں اور عورتوں کو دیکھ کر یہ خیال ضرور تقویت پکڑتا ہے کہ دنیا اتنی خراب نہیں کہ جتنی ان تصویروں میں دکھائی جاتی ہے۔

مصوری کی نمائش کے دوران ایک شخص تصویر کے سامنے خوش خوش کھڑا کہتا ہوا سنائی دیا "آخر کار مجھے بھی آج کی نمائش میں ممتاز اور نمایاں جگہ مل گئی ہے"

آس پاس کے لوگوں نے حیرت سے پوچھا "تو کیا آپ نے بھی نمائش میں حصّہ لیا ہے"؟ اس شخص نے بڑے فخر سے کہا "میں تو برسہا برس سے شریک ہو رہا ہوں مگر آج پہلی بار مجھے اس قدر اچھی جگہ ملی ہے" کسی نے پوچھا اچھا تو آپ کا شاہ کار کون سا ہے؟" اس شخص نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ عالم حیرانی میں سبھوں نے اس تصویر کی طرف دیکھا اور کسی نے کہا "یہ تصویر تو شہرہ آفاق مصور آرا کی ہے آپ کیسے کہتے ہیں کہ آپ کی تصویر ہے؟" اس شخص نے بے اعتنائی سے کہا "ہاں شاید آرا نام کے کسی شخص نے یہ تصویر بنائی ہے مگر تصویر کا فریم تو میرا بنایا ہوا ہے اور آج پہلی بار میرا بنایا ہوا فریم اتنی اچھی جگہ ٹنگا ہے۔"

مصوری کا ایک خاص شعبہ ہے جس میں برہنہ تصویریں بڑے اہتمام سے بنائی جاتی ہیں اور ان کی نمائش بھی کی جاتی ہے۔ اس غرض کے لئے بڑی خوبصورت اور دلگداز جسم والی لڑکیوں کو ماڈل بننا پڑتا ہے اسی طرح کی ایک نمائش میں ایک تصویر کے متعلق ایک عمر رسیدہ خاتون نے ڈاکٹر سیمول جانسن سے سوال کیا آپ کی نظر میں یہ فحاشی نہیں ہے؟ جانسن نے کہا "میڈم یہ تصویر فحش نہیں فحاشی تو آپ کے دماغ میں ہے جو آپ یہ سوچ رہی ہیں۔"

اسی طرح کی تصویر کے لئے ایک نوجوان لڑکی آرٹسٹ کے پاس روزانہ آیا کرتی تھی جس کو برہنہ پوز میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ ایک دن وہ آئی تو آرٹسٹ کی طبیعت کچھ سست تھی وہ تصویر بنانے کے موڈ میں نہ تھا اس لئے اس لڑکی سے بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا ساتھ ساتھ چائے کا بھی دور چلتا رہا۔ کچھ دیر بعد دروازہ پر دستک ہوئی تو آرٹسٹ بہت گھبرا گیا اور کہا "غضب ہو گیا۔ یہ تو میری بیوی آگئی ہے اور وہ یقیناً شک کریگی۔ تم فوراً اپنے کپڑے اتار کر بیٹھ جاؤ ورنہ اس کو سمجھانا مشکل ہوگا۔"

ایک اور اسی طرح کے آرٹسٹ کے اسٹوڈیو میں اتفاقاً اس کا ننھا منا سا لڑکا گھس آیا جب کہ ماڈل لڑکی بالکل عریاں بیٹھی تھی۔ آرٹسٹ کو فکر لگی کہ نہ معلوم اس کے کیا تاثرات ہوں گے اس نے اپنی بیوی سے بعد میں دریافت کیا کہ لڑکے نے اس کو کیا بتایا۔ بیوی نے بے اختیار ہنس کر کہا "وہ کہتا تھا کہ ممی تم ہم کو ہمیشہ ڈانٹتی اور ڈپٹتی ہو کہ ننگے پیر نہیں پھرنا چاہیئے اور وہاں ڈیڈی کے اسٹوڈیو میں تو بڑی عورت ننگے پیر تھی۔" ننھے کا مشاہدہ اسی حد تک تھا۔

اپنے فنی تعلقات اور ادب کے لحاظ سے ہٹ کر ایک بار آرٹسٹ نے وفور محبت سے اپنی ماڈل لڑکی کا پیار لے لیا۔ لڑکی نے خوش ہو کر پوچھا "اچھا بتاؤ تو تو کیا میں پہلی ماڈل لڑکی ہوں کہ جس کو آپ نے پیار کیا ہے"؟ آرٹسٹ نے سچ سچ جواب دیا "بے شک تم پہلی ماڈل ہو جس کا میں نے پیار لیا ہے۔" لڑکی نے پھر پوچھا "مجھ سے پہلے آپ کے ماڈل کون تھے؟" آرٹسٹ نے بتایا "چار ماڈل تم سے

پہلے تھے ایک گلدستہ، ایک پھلوں کا ٹوکرا، ایک اناناس اور ایک صراحی۔

ایک آرٹسٹ فخر یہ کہہ رہے تھے "اس سال کی مصوری کی کل ہند نمائش کے لئے میں نے بھی پینٹ کیا ہے اور وہ نمائش گاہ بڑی نمایاں جگہ پر لگائی گئی ہے۔ سننے والوں نے مبارک باد دی اور پوچھا کیا پینٹ کیا ہے؟" آرٹسٹ نے بتایا "میں نے ایک تختی پینٹ کی ہے جس پر لکھا ہے۔ ہاتھ لگانا منع ہے"۔

ہمارے ایک دوست دلّی سے لوٹے تو ہم نے پوچھا "کیا دلی میں آپ نے آرٹ گیلری دیکھی؟" ہمارے دوست نے بتایا "کیا ضرورت ہے ہماری لڑکی جو آرٹسٹ ہے"۔

ایک اور آرٹسٹ فخر سے کہہ رہے تھے کہ انہیں اپنی اس تصویر پر جس کا عنوان ہے 'مزدور کام پر' چونکہ حقیقت اور اصلیت کی تصویر ہے بڑا ناز ہے حاضرین نے بغور دیکھ کر کہا۔ اس تصویر میں مزدور تو دکھائی دیتے ہیں مگر کام پر نہیں لگے ہیں۔ آرٹسٹ نے بتایا "جی ہاں یہی تو حقیقت ہے"۔

آرٹسٹ نے آرٹ گیلری میں لگی تصویر کو بتا کر اعلان کیا "یہ میرا شاہکار ہے جب میں نے اس کو شروع کیا تھا مجھے خود پتہ نہ تھا کہ میں کیا بنا رہا ہوں۔" بور ہوتے ہوئے لوگوں نے کہا "وہ تو شاید آج بھی آپ نہیں جانتے کہ کیا بنایا ہے آپ نے"۔

فریم میں لگے سادہ کینوس کی طرف اشارہ کر کے آرٹسٹ نے کہا کہ یہ تصویر ہے جس میں گائے گھاس چرتی ہے؟ دیکھنے والوں نے سوال کیا "مگر اس میں

گھاس کہاں ہے ؟"

آرٹسٹ نے بتایا وہ تو گائے چر گئی ہے۔ پھر سوال ہوا کہ گائے کہاں ہے۔ آرٹسٹ نے جھنجھلا کر کہا جب گائے میدان کی گھاس چر گئی ہے تو کیا وہ بیوقوف ہے کہ وہیں ٹھہری رہے۔

آرٹسٹ کے ایک بے تکلف دوست نے کہا "میں جب آپ کی تصویریں دیکھتا ہوں تو حیرانی میں ڈوب جاتا ہوں۔" آرٹسٹ نے خوش ہو کر پوچھا "آپ اس بات پر حیران ہوتے ہوں گے کہ اتنی عمدہ تصویریں میں کیسے بنا لیتا ہوں" دوست نے کہا "جی نہیں۔ میری حیرانی تو یہ ہے کہ کیوں بنائی ہیں آپ نے یہ تصویریں"۔

اپنی لڑکی کی تصویریں بنانے کی غیر معمولی صلاحیت اور مہارت جتاتے ہوئے ایک صاحب نے کہا غروب آفتاب کی یہ لاجواب تصویر اسی نے بنائی ہے۔ اس نے آرٹ کی تعلیم پیرس اور لندن میں حاصل کی ہے" دوست نے کہا جب ہی کو۔ ورنہ ہم سوچتے تھے ایسا غروب آفتاب ہم نے ہندوستان بھر میں کہیں نہیں دیکھا۔"

آرٹ گیلری میں ٹنگی تصویر دیکھ کر کسی نے سوال کیا آخر یہ تصویر یہاں کیوں ٹانگی گئی ہے ؟" کسی دل جلے نے بے ساختہ جواب دیا شاید آرٹسٹ نہیں ملا تو اس کی تصویر ہی کو ٹانگ دیا۔"

ایک ہندوستانی شہرت یافتہ کلاکار اپنی کامیابی کا راز موٹر کار بتاتے ہیں۔ ان سے جب وضاحت طلب کی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ وہ موٹر کار کا آرڈر بک کرنے

کے بعد برسہا برس کے انتظار کی گھڑیاں بتانے کے لئے انھوں نے مصوری شروع کی اور آج شہرت کے آسمان پر پرواز کرتے ہیں لیکن زمین پر چلنے کے لئے ان کو ہنوز موٹر کار کا انتظار ہے

کسی بد شکل اور بد مزاج نودولتیئے کی تصویر کو مکمل کر کے مصور نے پوچھا "پسند آئی آپ کو اپنی تصویر؟" نودولتیئے نے بڑے غرور سے کہا "یہ تو ذرا بھی اچھی نہیں اور آپ کو ماننا پڑے گا کہ مصوری کا یہ بہت ہی ادنی نمونہ ہے۔"

کلاکار نے جواب دیا تو پھر آپ کو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ خود آپ بھی قدرت کا بڑا گھٹیا نمونہ ہیں۔

آرٹسٹ نے نزع کے عالم میں بیمار آدمی کی حسرت ناک شبیہہ بنائی اور اپنے ڈاکٹر دوست سے پوچھا "کیا رائے ہے آپ کی اس کے متعلق۔ ڈاکٹر نے بلا سوچے سمجھے کہا "لگتا ہے کہ اس کو بدہضمی کی شکایت ہے۔"

اسکول کی ڈرائنگ کلاس میں بلک بلک کر روتے ہوئے بچے کی تصویر بنا کر استاد نے پوچھا اس کو دیکھ کر تم کو کیا لگتا ہے؟ ایک غریب گھرانے کے لڑکے نے کہا مجھے لگتا ہے کہ اس بچے کو بھوک لگی ہے اسی لئے وہ رو رہا ہے۔ جب یہی سوال دہرایا گیا تو شہر کے رئیس کے لڑکے نے کہا "ہمارا خیال ہے کہ اس لڑکے نے بہت زیادہ کھانا کھا لیا ہے اور سوئے ہضمی سے رو رہا ہے اسی لئے تو شاید یہ محاورہ چل پڑا ہے کہ تصویر کے دو رخ۔

فوٹوگرافر کی دکان پر بورڈ لگا تھا ہم چھوٹی سی چھوٹی تصویر کا بھی اصل

سائز پر انلارجمنٹ کرتے ہیں۔ ایک صاحب دوکان کے اندر گئے اور پوچھا آپ سچ مچ اصل سائز پر تصویر بنا دیں گے" فوٹوگرافر نے کہا" ہاں صاحب ضرور بنا دیں گے۔" اپنی جیب سے ایک تصویر نکال کر کہا" لیجئے یہ ہمالیہ پہاڑ کی تصویر ہے اس کو اصل سائز پر بنا دیجئے جو بھی معاوضہ ہو ہم دیں گے۔"

مہاتما گاندھی مارگ پر دو فوٹوگرافروں کی دکانیں پہلے سے موجود ہیں ایک پر لکھا ہے ممبئی کا بہترین فوٹوگرافر' دوسری دکان پر بورڈ لگا ہے ہندوستان کا سب سے اچھا فوٹوگرافر تیسرے صاحب اپنی فوٹوگرافی کی دوکان کھول رہے ہیں "مہاتما گاندھی روڈ پر سب سے اعلیٰ فوٹوگرافر۔"

آرٹ پلے کے ریہرسل میں پریشان ایکٹر نے ڈائرکٹر سے شکایت کی کہ اس ڈرامہ کے کچھ بھی معنی و مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آرہے ڈائرکٹر نے جواب دیا تم نہیں جانتے کہ اس میں کیا ہے میں نہیں جانتا اور نہ خود اس کے لکھنے والے کو اس کا علم ہے اس لئے تو ہم اس کو آرٹ پلے کہتے ہیں۔

ڈرامہ پروڈیوسر بہت برافروختہ تھے اور اپنے ساتھیوں سے خفگی کے ساتھ بولے۔ پڑھا آپ نے، تنقید نگار نے میرے ڈرامہ پر کس قدر برا تبصرہ کیا ہے ایک ساتھی نے کہا اوہ اس کی تم بالکل پرواہ نہ کرو اس کو تو عقل ہے ہی نہیں وہ تو بس وہی کچھ دہرا دیتا ہے کہ جو اور بہت سارے لوگ کہہ رہے ہوتے ہیں

آپ جانتے ہیں پیشہ ور کلاکار اور شوقیہ کلاکار میں کیا فرق ہوتا ہے؟ پروفیشنل تو وہ ہے کہ جو اپنے باپ دادا کی کمائی پر اپنا شوق پورا کرتا ہے۔ اور

شوقیہ وہ ہے کہ جو کسی نہ کسی اور پیشہ یا دھندہ میں جان توڑ محنت کرتا ہے کہ فرصت کے لمحات میں اپنی کلا سے دل بہلا سکے۔"

آخر میں صرف یہ بتا دوں کہ فنون لطیفہ سے ہی انسانوں کی زندگی امر ہوتی ہے فن کی خوبصورتی کون ومکاں کو قائم رکھتی ہے اور اس کے سامنے وقت ٹھہر جاتا ہے۔ فنون لطیفہ کا سودا مستقبل میں ہوتا ہے۔

فنون لطیفہ کے ساتھ فن لطیفہ گوئی نہ ہو اور اس میں مزاح اور ظرافت نہ ڈھونڈھ سکیں تو ان کی لطافت نصف بھی نہیں رہتی۔

ہمارے بھی ہیں مہرباں

کہتے ہیں محبت ہو جاتی ہے کی نہیں جاتی اور چونکہ دوستی کا لازمی جز بھی محبت ہے تو دوستی بھی اصولاً ہو جانا چاہیئے۔ دوستی کرنے کا کوئی تصور نہیں پیدا ہو سکتا۔ مگر ہم نے تو یہی کچھ دیکھا ہے کہ دوستی کی بھی جاتی ہے اور بنائی بھی جاتی ہے بڑھائی بھی جاتی ہے اور توڑی بھی جاتی ہے۔ بہر حال اس کے سارے مدارج پائے جاتے ہیں۔ جتنی زیادہ مہذب اور تمدن یافتہ سوسائٹی ہوتی ہے اس میں دوستی کے مراحل بھی کچھ اسی انداز سے طے ہوتے ہیں۔ بالآخر ایک دن آتا ہے جب یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جو دوست ہے نہیں وہ تھا بھی نہیں اور اس کو دوستی کہنا غیر واجبی ہوگا۔

عشق اور پسند میں فرق یہی دیکھا گیا ہے کہ عشق بہر صورت ہوتا ہے اور پسند بہ صورت خاص یعنی عشق بغیر کسی وجہ کے ہوتا ہے اور پسند تو ظاہر ہے کہ وجوہات کی پابند

ہوتی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ دوستی عشق کے زمرے میں آتی ہے کہ پسند کی؟ اب تک تو دوستی کو عشق کا درجہ حاصل رہا، عشق کی طرح دوستی میں جان دے دینا معمولی سی بات رہی، جس کو دوست کہہ دیا مرتے دم تک اپنا سمجھا اس کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے سے گریز نہ کیا اور یہ بات ہر دو پہ صادق ہونی چاہیئے کہ لفظ دوست مرکب ہے۔ دو۔ است یعنی دو ہیں۔ اور جب تک دونوں برابر نہ ہوں دوستی کا قائم رہنا امر محال ہے۔

مگر آج کل تو زمانہ کا نظام ہی کچھ درہم برہم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اور دوستی کا توازن بھی قائم نہیں۔ اب تو دوستی کے بندھن میں ہر فریق دوسرے کو ہی حقوق اور فرائض کا پابند سمجھتا ہے اور خود کو آزاد۔ دوست پر بناہ کی ساری ذمہ داریاں اور خود ہر قسم کی ذمہ داری سے آزاد۔ کبھی کسی نزاعی امر میں فیصلہ مانگنے والے دونوں فریق دوست ہوں تو کبھی اس میں دخل نہیں دینا چاہیئے اس لئے کہ ایک دوست کی دوستی سے تو ضرور ہاتھ دھونا پڑے گا۔ برخلاف اس کے اگر دو اجنبی آپ سے اس طرح کی مدد مانگیں تو ضرور اپنا واجبی فیصلہ دیجئے گا ایک تو ضرور آپ کا دوست بن جائے گا۔ دوست کی میزبانی سے پوری طرح لطف اندوز ہو کر اپنی دوستی کا حق جتانا آج کل کا وطیرہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ بلا علم و اطلاع پہونچ جانا اور دوست کے گھر اور اس کی ساری املاک کو اپنا ہی سمجھ لینا دوستی کا طرہ امتیاز سمجھا جاتا ہے اور جب ایک بار آدھمکے تو یہ کبھی ظاہر نہ ہونے دیں گے کہ کتنے دن قیام کا قصد ہے اور جو ہم نے دبی زبان سے یہ بتلانے کی کوشش کی کہ آج کل ریل کا یا ہوائی جہاز کا ٹکٹ وقت

پر ملتا ہی نہیں اور اس کے لئے بہت دن پہلے سفارش اور اثرات کے ساتھ سعی کرنا پڑتا ہے۔ تو وہ ٹکا سا جواب دیدیں گے "ارے یار فکر نہ کرو وقت پہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" لیجئے پہلی ہی کوشش میں قطعی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، ہر روز صبح ناشتہ کے بعد دھڑکتے دل سے پوچھئے "دوپہر کھانے کو کب آئیے گا؟" بڑے اطمینان سے جواب دیں گے "آپ فکر نہ کیجئے اور نہ ہی کھانے پر انتظار کیجئے۔" اب ہم خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ شاید لنچ کہیں باہر کھانے والے ہیں۔ اور ہمیں کسی قسم کی زحمت نہیں ہوگی۔ مگر ان کا جملہ کچھ اس طرح پورا ہوتا ہے "ہاں بالکل انتظار نہ کرنا، ہمارا کھانا رکھ دینا ہم ڈھائی تین بجے کسی وقت بھی آکر کھالیں گے۔" لیجئے اب سارے لوازمات اور اس کی ساری پیچیدگیاں آپ کے سامنے ہیں۔ شام میں کہیں جانے والے ہوں تو کہیں گے "ہم چائے پی کر جائیں گے۔" اب چائے کی ذمہ داری بھی عائد ہوگئی۔ اہتمام، انتظام سب کچھ۔ ان کے احباب اور ملنے جلنے والے بھی ایسے ہی وقت پہ آجائیں گے کہ جب دن کا یا رات کا کھانا ہو رہا ہو یا شام کی چائے پہ بیٹھے ہوں، ایسے وقت میں دوست کا دوست بلکہ اس کے سارے دوست ہمارے ہی دوست ہوئے۔ مگر جب وہ ان کو اپنی طرف سے مدعو کر رہے ہوں تو "دوست کا دوست ہمارا بھی دوست" والی بات ہر ایک بھلا دیتا ہے۔ ہم میزبان اجنبی بن جاتے ہیں اور ہمارے دوست تکلفاً بھی نہیں کہتے "بھئی ہمارے میزبان دوست سے تو پوچھ لیں یا ان کو بھی شریک کر لیں۔ مزید خواری تو اس وقت ہوتی ہے کہ جب ہمارے دوست کی خاطر ہمارے گھر آنے والے پوچھ بیٹھتے ہیں "آپ کی تعریف؟" لیجئے اب ہم اپنے منہ اپنی تعریف کریں! البتہ

دوست انتہائی بے تکلفی سے کہیں گے۔

"ارے یہی تو ہمارے میزبان ہیں" اور بس بات وہیں پہ ختم۔

ہمارے دوست کچھ تو ایسے ہیں کہ جو ہمیں احساس کمتری میں مبتلا کر کے چھوڑتے ہیں۔ ان کے ساتھ سڑک پر چل رہے ہیں ہمارے کسی اچھے دوست نے دور سے ہم کو 'ہلو' کہا تو ہم جواب بھی دینے نہیں پاتے کہ یہ دوست جو ساتھ ہیں بڑے اخلاص اور بڑی یگانگت سے ان کے ہلو کا بے تکلفانہ جواب خندہ پیشانی سے دیں گے۔ اور کچھ دور جانے کے بعد ہم سے کہیں گے "نہ معلوم وہ بھلا آدمی کون تھا ہمیں یاد نہیں پڑتا کہاں ملا تھا۔ ویسے اس شہر میں ہیں بھی تو بہت سارے دوست"۔ لیجئے ہمیں موقعہ ہی نہیں کہ صاف صاف بتادیں "بھو نہیں وہ تو تم کو جانتا ہی نہیں"

ایک اور موقعہ پہ ہم اور ہمارے دوست موٹر پہ جارہے ہیں، راستہ میں باوردی کانسٹبل ہم کو بڑے ادب کے ساتھ سلام کرتا ہے اور قبل اس کے کہ ہم اس کا جواب دیں ہمارے ساتھی اس کے سلام کو قبول کرتے ہیں اور خود ہی کہتے ہیں۔ "ہمارے سالے کے سسرے یہاں پولس کے ڈپٹی کمشنر تھے ان کے ساتھ اس کانسٹبل نے ہم کو بہت دیکھا ہوگا۔ جب ہی تو اس قدر تمیز کے ساتھ سلام کر رہا ہے"۔

اس قسم کے مہمان دوستوں سے ہماری بیزاری کا راز ایک بار بری طرح آشکار ہوگیا۔ بات یہ ہوئی کہ ہم خود کسی خاص وجہ سے دوست کو اسٹیشن چھوڑنے نہ جاسکے اور جب یہ راستہ میں ڈرائیور سے بار بار کہہ رہے تھے کہ جلدی چلو ورنہ ہماری ٹرین چھوٹ جائے گی تو ہمارے ڈرائیور کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکل گیا "آپ فکر نہ کریں میں ضرور آپ کو وقت پہ پہونچادوں گا ورنہ صاحب

کا کہنا ہے کہ میری نوکری چھوٹ جائیگی۔"

کہتے ہیں قرض ایک قینچی ہے جو دوستی اور محبت کو کاٹ ڈالتی ہے۔ رقیع سے ہم نے کچھ قرض مانگا اس نے اسی کہاوت کا سہارا لے کر گریز کرنا چاہا۔ ہم نے صاف صاف کہہ دیا اس کی کچھ فکر نہ کرو ہم آپس میں دوست کب تھے۔

لز دولیتیر سے کسی نے پوچھا "اب جبکہ آپ کے پاس بے حساب دولت ہے، آپ کے افلاس کے زمانے کے دوست آپکو تنگ کرتے ہوں گے۔" اس نے جواب دیا "اس زمانہ میں میرے دوست تھے ہی کون، دوستی کے ان جھمیلوں کا یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمیشہ یہ شعر ورد زباں رہتا ہے۔

حریف غم ہوں محبت نباہ لیتا ہوں — ملے نہ دوست تو دشمن کو چاہ لیتا ہوں

اور کبھی کبھی بے اختیار عدم کا یہ شعر بھی گنگنا لیتا ہوں ؎

دل ابھی پوری طرح ٹوٹا نہیں — دوستوں کی مہربانی چاہیئے

اکثر تو خواجہ آتش کا یہ شعر اپنے حسب حال معلوم ہوتا ہے۔

دوستوں سے اسقدر صدمے اٹھائے جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

کہاوت ہے:۔ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے، ہمارے بدترین دشمن وہی ہیں کہ جو ہمارے بہترین دوست تھے اور جن سے ہم نے اسی جذبے سے باتیں کی تھیں۔

جس کے ہزار دوست ہیں وہ شاید ہی موقع پر اس کے ساتھ ہوں گے لیکن جس کا ایک ہی دشمن ہے وہ زندگی کے ہر موڑ پر مقابل ہوگا۔ دشمن کو معاف کرنا آسان ہے مگر دوست کو ——— ناممکن!

ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

یہ تو بالکل یاد نہیں کہ عہد طفلی کب ختم ہوا اور جوانی کی بہار کب شروع ہوئی
البتہ وہ زمانہ ضرور یاد ہے کہ جب ہم گنگنایا کرتے تھے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

اور تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا۔
وہ ایسا دور تھا کہ جب ایسا لگتا تھا کہ یہ ساری دنیا اور کل کائنات
ہمارے لئے بنے ہیں اور ہم ہی ان کے واحد حکمران اور مقتدر اعلیٰ ہیں۔

تھے دیارِ نو زمین و آسماں میرے لئے
وسعت آغوش مادر اک جہاں میرے لئے

ماں باپ کا لاڈ پیار اتنا تھا کہ جب ہم کو تھالوزی جماعت میں داخلہ ملا تو استاد
محترم کو تاکید کی گئی کہ کبھی چھڑی چلانا تو کجا ڈانٹ ڈپٹ بھی نہ کرنا بلکہ اگر
ہم سے کوئی خطا سرزد ہو تو ہمارے برابر بیٹھنے والے لڑکے کو سزا دینا وہی ہمارے
لئے باعث عبرت ہوگا اور ہم شرارت سے باز رہیں گے ویسے یہ نسخہ کبھی
آزمایا نہیں گیا اور ہم برابر پٹتے رہے۔

پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ فکر اور سوچ ابا گر ہوئے مزاج میں سنجیدگی آنے لگی اور غالب کا شعر موافق حال ہوا ے

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

وہ الھڑ پن اور بیفکری کا دور ختم ہوا اور لڑکپن روٹھ گیا۔ عمر رواں نے سن بلوغ کی طرف ڈھکیل دیا بقول سیماب

ہر چیز پر بہار تھی، ہر شے حسین تھی
دنیا حسین تھی مرے عہد شباب کی

پھر کالج کے ماحول نے دل و دماغ پر تراوٹ اور تازگی پیدا کی، نت نئی شرارتیں کھیل تماشے، شعر و شاعری، بیت بازی، ادھم، ہنگامہ آرائی، غرض یہ کہ زندگی بھرپور تھی، ہاسٹل میں نئے لڑکوں کی گت بنانا روز کا مشغلہ ہوا کرتا، کھانے کی میز پر دو ایک کو اپنے بیچ میں بٹھا کر باتوں میں لگاتے اور میز کے پلاسٹک کے نیچے نیچے دور سے نالی سی بنا کر لاتے اور عین ان لڑکوں کی گود میں پانی بہا دیتے، ان کا جھنجلانا، شرمانا کھسیانا پن قابل دید ہوتا گہری نیند میں سونے والوں کو پلنگ سمیت ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پہنچا دیتے اور پھر ان کی بیداری پر حیرانی و پریشانی کا تماشہ دیکھتے کبھی کبھی تو چارپائی الٹ دی جاتی بستر پر رنگ بھری بالٹی الٹ دیتے، سوتے میں کسی کے بالوں میں بال صفا پاؤڈر چھڑک دیتے۔

روایت ہے کہ کبھی ہندوستان میں ایسے لوگ بستے تھے کہ جو جسمانی اور روحانی اعتبار سے صحتمند صاف ستھری سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے اور کم از کم ڈیڑھ سو سال تو ضرور جیا کرتے تھے اس سماج میں بیمار پڑنا بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے اس کا صاف اور صریح مطلب یہی ہوتا تھا کہ اس فرد نے قدرت کے قانون کی

ضرور خلاف ورزی کی ہے۔ اب تو ہر بیماری کو خدا کی نامہربانی یا قدرت کے ستم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہ بالکل بھلا دیا جاتا ہے کہ صحت کے بگاڑ کے ہم خود ذمہ دار ہیں۔ ہماری لاپروائی اور بدپرہیزی ہی اس کا باعث ہوتی ہے۔ اور جس کو ہم جوانی کہتے ہیں وہ بھی ہم کو بہت جلد الوداع کہتی ہے۔ ورنہ لڑکپن سن بلوغ نوجوانی جوانی اور بڑھاپے کی حدیں تو کبھی معین نہیں ہوئیں۔ کافی عمر رسیدہ دکھائی دینے والے دو اجنبی باتوں میں لگے تو ایک نے کہا کہ میں نے تمام عمر کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وقت پر سوتا رہا اور ہر طرح محتاط زندگی گذاری ہے۔ دوسرے شخص نے ان کی عمر دریافت کی تو اس نے کہا ۷۵ برس، اور پھر اجنبی سے پوچھا کہ آپکی صحت کا کیا راز ہے، اس نے کہا راز کیا ہے کا میں تو خوب سگریٹ پیتا ہوں شراب جی بھر کے پیتا ہوں ہر قسم کی عیاشی کرتا ہوں اور ٹھاٹھ سے زندگی گذر رہی ہے پہلے والے شخص نے اس کی عمر پوچھی تو اس نے بتایا صرف ۳۰ سال، یہ حضرت اس عمر میں ۷۵ سالہ بڈھے کے ساتھی نظر آرہے تھے۔

ایک ۸۰ برس والے بڈھے سے اس کی طول عمری اور صحت کا راز دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ اوائل عمری سے اس نے بڑی محتاط زندگی گذاری ہے۔ کبھی سگریٹ شراب نہیں پیا، جوا نہیں کھیلا شب بیداری نہیں کی، جنسی الجھنوں سے دور رہا، یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ برابر والے کمرے میں گڑبڑ کی آواز سن کر پوچھا کہ اندر کون ہے، اس ۸۰ برس والے شخص نے بتایا کہ اس کا باپ ہے جو شراب نوشی سے روزانہ غٹ رہتا ہے اس کی عمر ۱۲۵ سال ہے۔

جوانی دیوانی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ جوانی میں ہر ایک اپنے

آپ کو اسی طرح عقل مند سمجھتا ہے جس طرح شراب کے نشہ میں آدمی اپنے آپ کو ہوشمند سمجھتا ہے۔ ایک صاحبزادے نہ صرف بلانوشی میں مصروف تھے بلکہ جنسی عیاشی سے بھی فرصت نہ تھی جب ان کے والد بزرگوار کو اس بات کا پتہ چلا تو انھوں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ دو دو برائیوں کا ایک ساتھ مرتکب نہ ہونا چاہئے۔ لڑکے نے باپ سے درخواست کی کہ وہی بتا دیں کہ کون سی برائی کو فوراً چھوڑ دینا چاہیئے۔ باپ نے بہت غور و خوض کے بعد یہ بتایا کہ شراب نوشی تو ساٹھ سال کے بعد بھی بآسانی ہو سکتی ہے۔

ونسٹن چرچل کی ۸۰ سال کی عمر ہونے پر ایک نوجوان فوٹو گرافر نے بطور نیک تمنا کہا کہ اس کی عین خواہش تھی کہ وہ چرچل کی سو سال عمر کی سالگرہ کے موقعہ پر حاضر رہے اور اس مبارک و مسعود موقع پر تصویر لے، چرچل نے کہا "کیوں نہیں تمہاری یہ آرزو بے شک پوری ہو سکتی ہے بشرطیکہ تم صحت مند اور صاف ستھری زندگی گذارتے رہو۔"

چرچل کو اپنے متعلق کوئی شک و شبہ نہیں تھا وہ تو نوجوان فوٹو گرافر کی صحت مند زندگی کی سوچ رہے تھے، اس قسم کی سوچ ہی تو سب کچھ ہے آدمی کی جیسی سوچ اتنی ہی اس کی عمر ہوگی۔

کہاوت ہے کہ عمر کی منزلیں جس تیزی سے طے کی جائینگی بڑھاپا اسی قدر تیزی سے آپ کی طرف بڑھے گا ویسے تو بوڑھے موت کی طرف رواں ہوتے ہیں لیکن موت تو جوانوں کی طرف چل کر جاتی ہے۔ جوانی میں جو بہت آگے کی سوچتے ہیں وہ بڑھاپے میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یہ کون نہیں جانتا کہ بڑھاپا ناگزیر ہے لیکن پھر بھی لوگ اس سے گھبراتے ہیں۔ زندگی سے پیار اور موت سے فرار کی کوشش،

نوجوانی میں صحت اور تندرستی کے مزے ضرور ہیں لیکن بڑھاپے کی آسائش کے لئے جوانی میں جو محنت کی جاتی ہے. اس سے بہتر تو یہی ہوتا کہ جوانی ہی میں پورا لطف اٹھالیا جاتا۔

ڈاکوؤں نے ایک گھر پہ چھاپہ مارا اور ایک جوان سی عورت کو دھمکی دی کہ جو کچھ مال و دولت ہے فوراً حوالے کر دے ورنہ وہ جان سے مار ڈالیں گے. عورت نے کہا مال و دولت تو میں نے اپنے بڑھاپے کے لئے جمع کر رکھا ہے وہ تو میں ہرگز نہ دوں گی چاہے تم جان ہی لے لو، کتنی صحیح سوچ ہے.

ڈاکٹر جانسن کا کہنا ہے کہ جوانی کی ہر بات قابلِ معافی ہوتی ہے لیکن اس کے آگے کے دور میں چھوٹی سی فروگذاشت بھی بڑھاپے کی دلیل بن جاتی ہے. جوانی میں کبھی کوئی چیز کہیں رکھ کر بھول جائیں تو اس کو سرمستی سے تعبیر کیا جاتا ہے. اور وہی بھول بڑھاپے میں ہو تو توازن کے بگڑ جانے کا ثبوت سمجھا جاتا ہے. جوانی میں ساری توانائیاں کسی بھی کام کرنے میں لگائی جاتی ہیں. تو بڑھاپے میں وہی تمام توانائی کام کے نہ کرنے کے بہانے ایجاد کرنے میں صرف کی جاتی ہے.

حضرت اکبرؔ:- جان دے دی غمِ حسیناں میں حق ادا کر دیا جوانی کا
خوب جی بھر کے ہو لئے بدنام حق ادا کر دیا جوانی کا

ہم اپنی جوانی کی باتیں سوچتے ہیں تو فیض کا وہ شعر بے اختیار یاد آتا ہے.
جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اٹھی جب ترا غم جگالیا، رات مچل مچل گئی.

لیونل سری مور سے کسی نے پوچھا "اب اس عمر میں بھی آپ کو ایکٹنگ

میں اتنا ہی لطف آتا ہے کہ جتنا جوانی میں آیا کرتا تھا؟"

لیونل بیری مور نے جواب دیا "دیکھو اب میں ۷۵ سال کا ہو چکا ہوں. اس عمر میں کسی بات میں بھی اتنا حظ نہیں آتا جتنا جوانی میں آیا کرتا تھا۔"

ہماری رائے میں تو جوان سال کے پاس سب کچھ ہوتا ہے اور پیرانہ سال کے پاس صرف سالہائے رفتہ کی لمبی قطار ہوتی ہے. جب کوئی سیکھنے سمجھنے سے گریز کرنے لگتا ہے تو یہی بڑھاپے کی نشانی ہے' چاہے یہ ۱۸ سال کی عمر میں ہو کہ ۸۰ سال' برخلاف اس کے جو سیکھنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا ہے وہ نہ صرف جوان رہتا ہے بلکہ تجربہ کی وجہ سے زیادہ ہی قابل احترام' چاہے اس کی جسمانی صلاحیتیں کتنی ہی گھٹ گئی ہوں

کہتے ہیں اولاد بڑھاپے کا سہارا ہوتی ہے لیکن درحقیقت وہی تو ہم کو بڑھاپے کی طرف تیزی سے ڈھکیلتی ہے اس لئے ہم کو نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ اپنی اولاد کی طرف سے بھی ہوشیار رہنا پڑتا ہے. اور وہی ہم کو نانا' دادا بنا ڈالتے ہیں. ویسے تو ہم کو دادا بننے پر کوئی اعتراض نہیں اگر سوچئے تو دادی یا نانی کے شوہر کہلانے پر کون خوش ہو سکتا ہے. اور سب سے زیادہ ان احساسات اور تاثرات سے کہ جب یہ محسوس ہونے لگے کہ:

گلوں میں گلوں کی سی بو نہ رہی ⁂ وہ عزیزوں میں لطف کی خو نہ رہی
وہ حسینوں میں رنگ وفا نہ رہا ⁘ کہیں اور کی کیا کہ وہ ہمیں نہ رہے
نہ وہ آن رہی نہ امنگ رہی ⁘ نہ وہ رندی و زہد کی جنگ رہی، عالم جوانی میں رندی و زہد کی جنگ کبھی نہیں رہتی، دل و دماغ ماؤف رہتے ہیں اور پھر وہ دور آجاتا ہے

جب یہ چلا چلا کر کہنا پڑتا ہے۔

اے مرے عہد جوانی! یہ زمانہ آگیا آج اپنی پارسائی کی قسم کھاتا ہوں میں

اور پھر ؎ محتاج اب ہم نہیں ناصح نصیحتوں کے
ساتھ اپنے سب وہ باتیں لیتی گئی جوانی

اور یہ جوانی ایسے جاتی ہے جیسے ؎

اختر شیرانی :۔ شباب مٹ گیا یادِ شباب باقی ہے
ہے بو شراب کی ساغر میں، اب شراب نہیں

یا جلیل مانکپوری :۔ منہ پھیر کے یوں گئی جوانی
یاد آگیا روٹھنا کسی کا

جوانی کی حدیں ختم ہونا اس وقت واضح ہوتا ہے کہ جب سر کے بال ایکدم سفید ہو جاتے ہیں یا بالکل غائب ہو جاتے ہیں جوش نے کیا خوب کہا ہے ؎

مرضی ہو تو سولی پہ چڑھانا یارب
سو بار جہنم میں تپانا یارب
معشوق کہیں آپ ہمارے ہیں بزرگ
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یارب

بالوں کی سفیدی کی شکایت ہے کہ انھوں نے ایسا سلوک کیا کہ کوئی دشمن بھی نہ کرے گا۔ یعنے حسینان ماہ پارہ اور مہ جبینانِ آہو چشم بابا کہہ کر مخاطب کرتی ہیں۔

سعدی نے تو جوانی کے گذرنے پر اتنا افسوس کیا کہ بالکل ہی

کہہ دیا ہے کہ جوانی کیا ختم ہوئی زندگی ہی ختم ہو گئی۔

دریغا کہ عہد جوانی گذشت
جوانی نگو، زندگانی گذشت

لیجئے اس عمر میں یہ کہنا کہ ہم بھی کبھی جوان تھے ایسا ہے جیسے ذوقؔ نے کہا ہے ؎

وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

لیکن اکبرؔ الہ آبادی کو بھی سن لیجئے ؎

مری نسبت یہ فرماتے ہیں واعظ بد گماں ہو کر
قیامت ڈھائیگا جنت میں یہ بوڑھا جواں ہو کر

قطع کلام

کہیں مجمع بے قابو ہے شور وغل بپا ہے لوگ ہنگامہ آرائی پر تلے ہیں نقض امن کا اندیشہ ہے تو ایسی صورت میں کہا جاتا ہے کہ بجائے لاٹھی چارج یا فائرنگ کے اس کو منتشر کرنے کے لئے آسان طریقہ یہ ہے کہ چندہ کی اپیل کر ڈالئے اور پھر دیکھئے کہ وہ مجمع پلک جھپکتے میں کیسے چھٹ جاتا ہے اور لوگ پرامن طریقے پر تتر بتر ہو جاتے ہیں. مگر ہم نے تو دیکھا ہے کہ ساڑھے تین ہزار کا مجمع بے قابو ہوا جا رہا تھا نہ کسی شاعر کا رنگ جمتا تھا اور نہ کسی لطیفہ گو کو سننے کے لئے لوگ تیار تھے ایسے میں ایک سانولا سلونا سا چھریرے بدن کا سنجیدہ صورت شخص اسٹیج پر آتا ہے اور غیر ضروری تعارف اور تمہید کے بغیر اپنا مضمون سنانا شروع کرتا ہے. ایک دو ہی جملوں میں سارا مجمع ہمہ تن گوش ہو جاتا ہے. وقفہ وقفہ سے داد و تحسین کا ہلکا سا شور اٹھتا ہے اور پھر دب جاتا ہے. ایسے لگتا تھا کہ یہ رات بھر اپنا مضمون سناتا رہے تو بھی لوگ اسی طرح ذوق و شوق سے سنتے رہینگے.

یہ تھے مجتبیٰ حسین اور یہ تھا ان کے مزاح کا شگوفہ.

ان کی تحریر و تقریر میں سلاست ہے. روانی ہے، خیالات کا تسلسل ہے شگفتگی ہے. صاحب ذوق کے لئے تفریح و تعیش کا سامان ہے تو کم سمجھ بوجھ والے کے لئے

بھی ہنسنے ہنسانے کا سامان، یہ کسی پر چوٹ نہیں کرتے کسی کی پگڑی نہیں اچھالتے کسی کو کیچڑ میں نہیں گھسیٹتے، نہ تو کسی کی تنقیص ہے نہ کسی کی تضحیک، یہ خود پر ہنستے ہیں اور دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ کبھی اپنے آپ کو نشانہ ملامت بناتے ہیں تو کبھی اپنے تخلیق کردہ کردار کو ایسے رنگ و روپ میں پیش کرتے ہیں کہ اس پر ہنسی تو آتی ہے لیکن وہ ہماری نظروں میں گرتا نہیں۔ اگر یہ ڈاکٹر حکیم کی بات کر رہے ہوں تو اپنے عارضہ کی کیفیات اس طرح سنائیں گے کہ ان کے ساتھ ہمدردی ہو جاتی ہے اور ڈاکٹر و حکیم کی بے چارگی پر ہنسی آتی ہے۔ کبھی ان کا ڈاکٹر مریض بن جاتا ہے۔ تو کبھی خود ڈاکٹر بن جاتے ہیں اور ہنسنے کا نسخہ تجویز کر ڈالتے ہیں۔

رکشا والوں کی حکایت سنا رہے ہیں تو اس میں ان کا خود کا کردار ہوگا۔ مگر یہ اس کہانی کے ہیرو نہیں بنیں گے۔ بلکہ رکشا والے کو ہی ہیرو کا روپ دیں گے اس کو ترکی بہ ترکی اور فارسی بہ فارسی جواب سنائیںگے اور حقیقت بھی آشکارا ہو گی کہ بس کا کرایہ رکشا سے سستا اس لئے ہے کہ بس پٹرول سے چلتی ہے اور رکشا خون سے چلتا ہے۔ جی ہاں خون سے اور یہی خون رکشا راں کی آنکھوں میں سرخی پھیر دیتا ہے اور کبھی کبھی اس کے پھیپھڑوں سے گرتا ہے۔ ان کی بصیرت اتنی تیز اور مشاہدہ اتنا قوی ہے کہ رکشا راں کے سارے جوہر اور کرتب کھول کر رکھ دیں گے جیسے کہ مجتبیٰ ایک ماہر اور مشاق رکشا راں ہیں۔ انھیں حاضر جواب ادیب، شاعر، فلسفی خلیق بیروزگار گریجویٹ غرض کہ ہر قسم کے رکشا راں سے سابقہ پڑتا ہے، یہ ہر ایک کا دل رکھتے ہیں اس کی تکلیف کو اپناتے ہیں۔ مگر شاید ان کو وہ رکشا چلانے والا نہیں ملا کہ جس نے ہم کو اپنا نام بڑے فخریہ انداز میں اسد اللہ خاں غالب بتایا تھا

ہم نے بطور تفنن اس سے پوچھا ارے بھائی ہم کو ایسے لگتا ہے کہ یہ نام ہم نے بہت سنا ہے؟ اس پر وہ فرماتے ہیں "کیوں نہ ہو صاحب آپ نے ضرور سنا ہوگا اور بہت سنا ہوگا۔ ہم اس شہر میں آج ۲۵ سال سے رکشا چلا رہے ہیں"۔

مجتبیٰ کبھی بھی کسی کو طنز کا شکار نہیں بناتے بلکہ خود کو اچھا شکاری بناتے ہوئے اپنے ہی شکار کا شکار ہو جاتے ہیں۔ گھوڑ دوڑ کے میدان میں یہ کہہ کر کہ "دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے" خود ہی کو دوڑتے ہیں ہارتے ہیں تو فرماتے ہیں گدھا جب گھوڑے پر بازی لگاتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ خوبصورت خاتون کے منھ سے گھوڑے کی تعریف اس طرح کراتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ اس کا منگیتر بننے کی بجائے خود گھوڑا بن جائیں۔

اگر یہ مرزا کا خاکہ اڑاتے ہیں اور "چاند اور آدمی" کی بات کرتے ہیں تو ایسے نکتے نکالتے ہیں کہ آدمی کا دل دنیا سے اٹھ جائے اور بجائے جنت کی ہوا کھانے کے چاند پر چاندنی کا لطف اٹھانے کی ٹھان لیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ یہ سورج کی باتیں نہیں کرتے ورنہ سورج کا رخ کر کے آدمی جھلس کر رہ جائے۔ مگر ٹھہرئیے یہ تو ان لوگوں میں سے ہیں کہ سورج پر بھی آپ کو پہونچا دیں اور کہیں ڈرئیے نہیں ہم آپکو دن میں سورج پر نہیں لے جائیں گے بلکہ رات کی ٹھنڈک میں، اور چاند پر اور کچھ نہ سہی آپکو گاندھی جی کی تعلیمات کو عام کرنے میں اولیت کا شرف بھی بخشنا چاہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ گاندھی جی تو عدم تشدد کی بات کرتے کرتے عدم آباد کو سدھارے اور دنیا والوں کے لئے تشدد چھوڑ گئے۔

مرزا غالبؔ کی پریس کانفرنس کو پڑھ کر ہمارے ایک تو دولتئے دوست کہنے لگے بھئی یہ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں نظام جنگ کون ہیں۔ ان کی بڑی تعریف سنی

ہے اور ہم ان کو اپنے ہاں دیوالی کے ڈنر پر مدعو کرنا چاہتے ہیں ملاحظہ کیا آپ نے مجتبیٰ کا کمال کہ جو کام غالب صدی کی تقاریب نے نہیں کیا وہ ایک زندہ جاوید ہستی کو سچ مچ زندہ کر ڈالتے ہیں۔ اگر فسادات کی ہولناک اور درد انگیز خبریں سنتے سنتے آپ کے کان پک گئے ہوں تو سندباد جہازی کا سفر نامہ پڑھئے اس کے بعد جی چاہے گا کہ سرکار سے درخواست کی جائے کہ وہ اب تحقیقاتی کمیشن بٹھا بٹھا کر روپیہ اور وقت ضائع نہ کرے اس سفر نامے سے بڑھ کر کوئی مصدقہ اور آنکھوں دیکھی روداد نہیں ملیگی۔ اسی میں ایسے دردناک مسئلہ کے سارے محرکات بھی ہیں اور اس کے حل بھی۔ یہ تو مجتبیٰ کا ہی حق ہے کہ وہ اس بھیانک موضوع پر اس طرح کا طنزیہ لکھیں اس کا تجزیہ کریں اور عبرت کا سبق دیں۔ ایسے لگتا ہے کہ مجتبیٰ کے پاس موضوعات کی کمی ہے نہ عنوانات کی بلکہ وہ تو بلا عنوان بھی لکھ سکتے ہیں نوکر یا باورچی ہی کو لیجئے ان کے مزاج میں وہ کون سی خوبی ہو سکتی ہے کہ جو مزاح اور ظرافت کی محرک ہو۔ مگر مجتبیٰ تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس دنیا میں وہ کون سا بھلا مانس تھا کہ جس نے اپنے کام سے بچنے کے لئے ایک نوکر کی خدمات حاصل کیں اور آنے والی نسلوں کو نوکر کا چاکر بنا کر رکھدیا ایک طرح سے یہ مقولہ ثابت کر دیا کہ "خادم القوم مخدوم" یعنی جو خدمت کرتا ہے وہی آقا بنتا ہے ان کے نوکر میں ہم سب کو اپنے اپنے نوکر کی جھلک ملتی ہے اور اپنی مجبوریاں جو دل میں دبی دبی تھیں یکلخت باہر نکل پڑتی ہیں۔ انھوں نے شاید اپنی عزت رکھنے کو وہ واقعہ نہیں سنایا کہ ان کی بیگم سے نوکر ناراض ہو کر دھمکی دیتا ہے کہ نوکری چھوڑ کر چلا جائے گا اور پھر یہ بھی کہتا ہے بیگم صاحب آپ تو مجھ کو اس طرح ڈانٹتی ڈپٹتی ہیں اور ایسا سلوک کرتی ہیں

کہ جیسا آپ صاحب کے ساتھ کیا کرتی ہیں مگر یہ نہ بھولئے کہ ہمارے صاحب تو مجبور محض ہیں کہیں جا نہیں سکتے میرے لئے ایسے اور پچاس گھر ہیں جہاں چاہے جا سکتا ہوں۔

نئے سال کی مبارکباد اس انداز سے دیتے ہیں کہ جی چاہتا ہے پرانے سال کے جال میں ہی پھنسے رہیں چاہے مرغ لو گرفتار کی طرح پھڑکتے رہیں گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے تو بہت سنا تھا لیکن ادیبوں کے گھریلو حالات بے تصویر پڑھ کر تو یقین ہو گیا کہ چاہے یہ ادیبوں سے کسی اور مقابلہ میں ہار جائیں لیکن اپنے گھریلو حالات کی حد تک یہ کسی اور ادیب کو آگے بڑھنے نہیں دیں گے اس لئے کہ ان کے باقی گھریلو حالات لائق تشکر ہیں۔

اردو شاعری کے ٹیڈی بوائے اور ظ انصاری سے ظ انصاری تک اور سب خاکے اور مرقعے پڑھ جائیے تو یہ لگتا ہے کہ یہ واقعات نہ صرف ہمارے سامنے ہو رہے ہیں بلکہ ہمارے ساتھ ہو رہے ہیں۔ پربیتی اور جگ بیتی ان کی نگارش قلم کی خوبی ہے ہر ایک کی آپ بیتی بن جاتی ہے۔ مجتبیٰ کچھ اس طرح سے نئے نئے زاویئے بناتے جاتے ہیں کہ ہم کو سینما کے تھری ڈی فلم کا سا لطف آنے لگتا ہے۔ یہ سچ مچ سہ جہتی مزاح کے خالق ہیں اپنے چنے ہوئے یا تخلیق کردہ کردار کے ساتھ ساتھ یہ خود چلتے ہیں کبھی اس کو سہارا دیتے ہیں اور کبھی اس کا سہارا لے کر خود آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور پھر کبھی کبھی پڑھنے سننے والوں کو بھی ان حوادث میں شریک کر لیتے ہیں۔ از ابتدا تا انتہا یہ لگتا ہے کہ یہ بت ساز ہیں مجسمہ بناتے ہیں اس میں آواز بھرتے ہیں اور پھر اس کو ساتھ لئے دنیا والوں کو ہنساتے پھرتے ہیں ان کا مزاح سہ جہتی ہے۔ ان کی کتاب قطع کلام اردو ادب میں زندہ رہے گی۔

گھر آنگن

گھر آنگن، چولہا چکی، دال روٹی، سیون پرووَن، تلے دانی، بونج بن گھر گرہستی کے لوازمات ہیں۔ جو ہر گھریلو عورت اپنے مقسوم میں لکھا لاتی ہے۔ فکر معیشت، غم روزگار، غم دوراں دماغی کیفیات ہیں جن سے کسی مرد کو چھٹکارہ نہیں، دنیا کی گاڑی انھیں دو پہیوں کے سہارے چلتی ہے۔ اور دنیا کے کاروبار کا یہی ڈھنگ ہے۔ جب زندگی اسی نہج پر چل رہی ہو تو پھر ادھر ادھر کی باتیں سوچنے کا موقع ہی کیا ہے اور جو موقع نکلے بھی تو گھر سے باہر ہی۔ جہاں شادی ہوئی کہ بیوی ساس سسر نند نندوئی اور دیگر سسرالی رشتہ داروں کی خدمت میں لگ جاتی ہے اور شوہر کا منھ دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ وہ چاہے منھ دیکھے کہ نہ دیکھے بال بچے آل اولاد اور خاندان کی تربیت، تدوین، تزئین اور سلسلہ واری شروع ہو جاتی ہے۔ اور اگر محض حسن اتفاق سے کچھ عشق و عاشقی کی بنیادوں پر شادی ہوئی ہو تو اس کے متعلق حضرت اکبر الہ آبادی نے اس کی بشارت یوں دی ہے کہ ؎ عاشقی قید شریعت میں جو آجاتی ہے

جلوۂ کثرت اولاد دکھا جاتی ہے

گھریلو زندگی کا نقشہ اسماعیل میرٹھی نے کچھ یوں کھینچا ہے: "ماں بچے کو گود میں لئے دودھ پلا رہی ہے۔ باپ حقّہ پی رہا ہے چلم بجھ جاتی ہے تو کبھی نیچے میں پانی رک،

جاتا ہے"۔ آج کل سارے پکوان گیس پر ہوتے ہیں یا "پرائی مس" کے چولہے پر بیچارے باپ کے حقہ کے لئے کوئلہ بھی مشکل ہی سے ملتا ہے۔ ایسی صورت میں بتائیے کہ میاں بیوی کیا کر سکتے ہیں سوائے اس کے کہ ایکدوسرے کے عیب گنائیں' آپس میں پیار و محبت کی باتوں کا تصور ہی مٹتا جا رہا ہے۔ عشق و عاشقی کا دور طالب علمی کے ساتھ اور پھر شادی سے پہلے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جو کبھی دورہ پڑا بھی تو فرصت اور استطاعت کس کو نصیب ہے۔ کبھی کسی باغ میں رات گئے دیر تک چہل میں بیٹھے بھی ہوں تو گشت کرنیوالا سپاہی ضرور پوچھے گا کیا تم دونوں شادی شدہ ہو؟ اور جواب تو یہی ہو گا ہاں ہم دونوں شادی شدہ ہیں۔ اس پر لازماً ہدایت ہو گی کہ پھر گھر کیوں نہیں جاتے، ظاہر ہے تب سوچ ہو گی کہ کس کے گھر جائیں عورت کا شوہر یا مرد کی بیوی کیسے ان کو گھر کے اندر قدم رکھنے دیں گے۔

لگتا ہے میاں بیوی کے بندھن میں پیار و محبت کا کوئی مقام نہیں ہے انگریزی معاشرہ میں تو سب کچھ جائز ہے اور ہر بات کی سہولت ہے' کسی کمپنی کے سیلس مین نے دور دراز مقام سے تار بھیجا کہ وہ کمپنی کے لئے خریداری میں مصروف ہیں اور دیر لگے گی لوٹنے میں۔ بیوی نے جوابی تار بھیجا کہ اگر وہ اپنی خریداری ختم کر کے جلد ہی گھر نہ لوٹیں گے تو یہ خود اس جنس کی فروخت شروع کر دیگی جس کی شوہر خریداری کر رہے ہیں۔ جیسے کو تیسا لیجئے کیسا انصاف ہے۔

دنیا بھر کی تمام زبانوں میں شاعری اور رومان شادی کے بندھنوں سے پہلے یا ان بندشوں سے پہلے پروان چڑھتے رہے ہیں۔ بالخصوص اردو میں ہجر و فرقت جدائی اور مجبوریاں طرفین کی عائد کردہ پابندیاں۔ رقیب کی خلل اندازیاں یہی تو حاصل کلام ہوا کرتے ہیں

مغربی ماحول میں البتہ کورٹ شپ کا زمانہ بڑا رنگین ہوتا ہے. وہاں پر پابندیاں ہٹا دی جاتی ہیں صرف انتظار اور شادی کے سوا باقی راستے صاف رہتے ہیں. اسی لئے تو مشرقیوں نے بڑے فخر کے ساتھ کہنا شروع کیا ہے کہ بھئی مغرب میں پہلے عشق و محبت پھر شادی' اور ہمارے ہاں اس کے برعکس پہلے شادی پھر پریم کے پینگ' مگر بتائیے نا کہاں رہے وہ رنگین زمانہ اور وہ پر کیف دن اور رات حضرت عشق کی کارفرمائی گھر میں تو کہیں نظر نہیں آتی. اسی لئے ہماری شاعری میں رومان متاہلانہ زندگی کے باہر باہر ہی چکر کاٹتا رہا ہے. کہیں تاک جھانک کہیں کسی کو دیکھ کر آہ بھر لی کبھی کسی کو بالواسطہ پیام بر کے ذریعے پریم پتر بھیج دیئے. وہ بھی ڈرتے ڈرتے کہ اگر کسی کو رازداں بنالیا تو پھر ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

شاعری میں میاں بیوی کے تعلقات کا کہیں کچھ ذکر ملتا ہے تو جعفر زٹلی کی ہجو میں ؎

کھائے بہت اور کچھ نہ کرے　　سارے گھر سے لڑتی پھرے
کام کرے تو ایسا کرے　　چولھے کی ہانڈی کھڑی دھرے

البتہ اختر شیرانی جیسے رومانی شاعر نے سلمیٰ سے ہٹ کر لکھا تو "پردیسی پی کی یاد" ایک ہجراں نصیب بیوی کی زبانی یوں لکھا ؎

مگر اب ان کے جاتے ہی قیامت ہو گئی برپا
جس آفت کا تھا اندیشہ وہ آفت ہو گئی برپا

اختر شیرانی نے ہی "پہلا خط" ایک بیوی کی طرف سے اپنے شوہر کے نام اس طرح لکھا ہے.

؎ احوال دل لکھوں، خلش مدعا لکھوں　　رکتی ہوں لفظ لفظ پہ آخر کیا لکھوں

گھر آنگن کی شاعری کا انداز فارسی میں مغل شہنشاہ جہانگیر اور ملکہ نور جہاں کے مکالموں میں ملتا ہے۔

جہانگیر:۔ ترا کہ تکمۂ لعل است در قبائے حریر
شدہ است قطرۂ خونِ منت گریباں گیر

(تیری حریر کی قبا میں لعل کا تکمہ لگا ہوا ہے دراصل میرے خون کا قطرہ تیرے گریباں میں لگا ہے)

نور جہاں:۔ نیست جاناں در گریباں تو رنگ زعفران
زردئ رنگ رخ ما شُد گریباں گیر تو

(اے محبوب تیرے گریباں میں زعفران کا رنگ نہیں ہے بلکہ ہمارے چہرے کی زردی تیری گریباں گیر ہے)

ھندی کے دوہوں میں بھی کہیں کہیں ایسا رنگ ملتا ہے ؎

پیاری ہمری نیند کی بات تمہارے ہاتھ
آوت تھی تم ساتھ ہی، گئی تمہارے ساتھ

پریتم ہم تم ایک ہیں کہن سنن کو دو ئیے
من سے من کو تول لو، دو من کبھو نہ ہوئے

اسی کچھ استثناء کے سوا ہماری شاعری میں زیادہ تر معشوق کی تصویر ہیجان انگیز طریق پر کھینچی جاتی رہی ہے اور ایسے لگتا ہے کہ کوک شاستر پڑھ رہے ہیں ؎

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی　　اف تری کافر جوانی جوش پہ آئی ہوئی

دی شب وصل موذن نے اذاں پچھلی رات　　ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا

نمودِ حسن دو فی ہو گئی ہے خود نمائی سے — ابھر آیا ہے جوبن اور جب وہ تن کے بیٹھے ہیں
اڑائے جاتے ہیں عاشق کے دل کو سینہ زوری سے — غضب کے دو اچکے بھیس میں جوبن کے بیٹھے ہیں

جاں نثار اختر نے پہلی بار ہدایت نامہ بیوی خاوند جیسی لاجواب چیز پیش کی ہے جس کا نام ہے گھر آنگن ان کا یہ نیا تجربہ اچھوتا مضمون اور دل چسپ انداز بیاں اردو شاعری اور تفکر کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس کے اتباع اور پیروی کی سخت ضرورت ہے تاکہ اردو ادب اس نئے مضمون سے مالامال ہو جائے اور شادی شدہ حضرات کو بے کیف زندگی میں کیف نصیب ہو۔

جاں نثار اختر نے جس گھر والی کو پیش کیا ہے وہ صرف محبوبہ نہیں بلکہ ؎

تو کتنی گھریلو سی نظر آتی ہے — لپٹی ہوئی ہاتھ کی دھلی ساری میں

شوہر کی خدمت کا ولولہ ملاحظہ فرمائیے ؎

سوتے سے اٹھی کہ گرم کھانا کر دے — لو کا جو لگا جھلس گئی سب کایا

گھر کے کام کاج کی مصروفیت کا نقشہ کتنا دل چسپ ہے ؎

گاتی ہوئی ہاتھوں میں یہ سنگر کی مشین — قطروں سے پسینے کے تر اور جبیں
پانی کبھی دے رہی ہے پھلواری میں — کپڑے کبھی رکھ رہی ہے الماری میں
آٹے میں سنے ہوئے ہیں دونوں ہی تو ہاتھ — آنچل جو سنبھالے تو سنبھالے کیسے

اب اس کو کفایت کہو یا اس کا شعور — عورت کا تو یہ گن ہے سدا سے مشہور
ہر طرح کی تنگی بھی اٹھالے گی مگر — چپ چاپ سے کچھ بچا کے رکھے گی ضرور

بچوں کے لئے پکاتے ہوئے روٹی اک بار — چمٹا جو لگا تو پڑ گئے ہیں چھالے

پھر بھی انھیں ہاتھوں سے وہ کپڑے دھوئے — اور خود ہی نچوڑ، الگنی پر ڈالے

گھر گرہستی کے کتنے خوبصورت روپ دکھائے ہیں جاں نثار اختر نے اب دیکھئے یہ بیوی محبوبہ یا معشوقہ دلبر دل آرا کیسے بن جاتی ہے روئداد شروع کی ہے سہاگ رات سے ؎

وہ پہلے پہل تجھ کو منانے کا سرور — گھونگھٹ میں وہ کھڑے کا جھکتا ہوا نور
شرما کے وہ باہوں میں سمٹنا تیرا — آنکھوں میں کنوارپن کا وہ میٹھا سا غرور
وہ تیری سپردگی کا عالم توبہ! — کولھوں سے وہ خود بخود سرکتی ساری

گھر بار کی ساری تصویریں ان قطعات میں ابھرتی ہیں روزمرہ کے دکھ سکھ کاروبار سے باہر آنا جانا انتظار حسن گفتار تنگدستی کا عذاب فراغت کی گھڑیوں کا انتظار سبھاؤ، سلیقہ، دلاسہ سب کچھ ہے لیکن اس روزمرہ کی انجمن میں پیار نہ تو مرتا ہے نہ تو کھو جاتا ہے ؎

اب تک وہی بچنے کی سمٹنے کی ادا — ہر رات مناتا ہے میرا پیار تجھے
سمجھا تھا تجھے جیت چکا ہوں لیکن — لگتا ہے کہ جیتا ہے ہر بار تجھے

جلتے ہوئے وہ پیار سے کہنا میرا — ہر رات تو سپنوں میں نظر آئے گی
اور اس کا بڑے ناز سے اتنا کہنا — کیا میرے بنا نیند بھی آ جائے گی

چھیڑ چھاڑ ملاحظہ فرمائیے زبان کی شیرینی اور لوچ نے عورت کے لب و لہجہ کو اتنا دلچسپ بنا دیا ہے کہ اگر ہمیں شاعر کا نام معلوم نہ ہو تو بالکل ایسا لگے کہ یہ عورت کی کہانی خود اس کی زبانی ہے ؎

وہ جان کے بھی مجھ کو ستاتے ہیں کبھی — نکلوں جو نہا کے تو ڈراتے ہیں کبھی

آئینہ کے آگے نہ بدلنا کپڑے　　آئینے میں عکس رہ بھی جاتے ہیں کبھی

ایک صحت مند تنومند جذبات سے بھرپور عورت کو ایک نہ ایک دن یا وجود خاندانی منصوبہ بندی کے اس بات کا بھی سابقہ کرنا پڑتا ہے ؎

اک روپ نیا آپ میں پاتی ہوں سکھی　　اپنے کو میں بدلی نظر آتی ہوں سکھی

خود مجھکو مرے ہاتھ حسیں لگتے ہیں　　بچے کا جو پالنا ہلاتی ہوں سکھی

ریختی گوئی کیا ختم ہوئی کہ عورت کی زبان میں اس کے جذبات کے اظہار کا طریقہ بھی یکلخت ختم ہو گیا۔ کیا تو مرد بیگماتی زبان میں خوب گل کھلاتے تھے اور بعض شاعر تو عورتوں کے لباس میں مشاعرہ میں شرکت کیا کرتے تھے، اب تو خاتون شعراء بھی مردانہ وار صیغۂ تذکیر ہی میں سب کچھ کہتی ہیں۔

جاں نثار اختر نے اس اسلوب کو بڑی عمدگی سے ایک نئے روپ میں نبھایا ہے۔ اور گھریلو عورت کو ایک نیا نکھار، نیا جذبۂ وارفتگی عطا کیا ہے ؎

ہر رسم و روایت کو کچل سکتی ہوں
جس رنگ میں ڈھالیں مجھے ڈھل سکتی ہوں

اکتانے نہ دوں گی ان کو اپنے سے کبھی
ان کے لئے سو روپ بدل سکتی ہوں

جاں نثار اختر کی گھر والی ناز و انداز، حیا، شوخی اور بے باکی سے بھی بیگانہ نہیں ؎　رہتا ہے عجب حال مرا ان کے سات
لڑتے ہوئے اپنے سے گذر جاتی ہے رات

کہتی ہوں کہ اتنا نہ ستاؤ مجھ کو
ڈرتی ہوں کہیں مان نہ جائیں مری بات

بات مان جانے کا ڈر بھی کس قدر دلچسپ ہے۔ خدا کرے کہ یہ رنگ اور یہ اسلوب جلد از جلد مقبول اور ہر دلعزیز ہو اور اس کا اتباع تمام متفکما ور شاعر شروع کردیں تاکہ مبتاہلانہ زندگی میں پھر سے جان پڑ جائے۔

یہاں پر بیوی ناصح یا محتسب نہیں ہے بلکہ ؎

کل تم تو چلی جاؤگی پھر کون بھلا
اس طرح رکھے گا مرے پینے کا حساب
ہاتھوں سے مرے چھین کے بوتل ہر رات
اپنے ہاتھوں سے کون ڈھالے گا شراب

قصّہ مختصر

قصّہ مختصر مجتبیٰ حسین نے تو اس بار سارے قصہ کو مختصر کر دیا ہے خود کا احوال مختصر ہے مختصر انتساب بے حد مختصر، پیش لفظ یا ان کے الفاظ میں پس و پیش لفظ، تعارف، مقدمہ، دیباچہ، عرض احوال، حرف اول حرف آخر کو اتنا مختصر کیا کہ سرے سے غائب، قصہ مختصر میں بلا اختصار دلچسپ عنوانات اور موضوعات پر زوردار قلم فرسائی کی ہے الا اس کے کہ کوئی مزاح کی حس اور شئے لطیف سے محروم ہو، ہر جملہ کی لطافت و ظرافت سے لطف اندوز ہونا ناگزیر ہے۔

میں اور میرا مزاح بھی ایک قصہ مختصر ہے اور انکساری کا آئینہ دار ورنہ مجتبیٰ حسین کا مزاح تو چلتا پھرتا اور رواں دواں مزاح ہے۔ یہ سنے راما (CINE RAMA) کی طرح سب کو اپنے میں سمو لیتا ہے۔ یہ نہ پر بیتی ہے نہ جگ بیتی بلکہ ہر ایک کو آپ بیتی لگتی ہے۔ ان کا مزاح بقول ان کے کاغذ قلم کے سوا ایک کیفیت کی پیداوار ہے اور لگتا ہے کہ ان پر ایک کیف طاری ہوتی ہے اور وہ سب کو اپنے وجدان یا حال میں اسی طرح رنگ لیتے ہیں کہ جیسے قوالی کی محفل میں کسی ایک کو حال آنے پر سب ہی اس حال میں لپیٹ جاتے ہیں اور بے حال ہو جاتے ہیں۔ مستری، فقیر، مرزا، سب ہی کے روپ بہروپ سینما کی فلم کی طرح دماغ کے پردہ پر چمک اٹھتے ہیں۔ یہ اپنے قارئین کے وجود کے

پیمانہ کو لبریز کر دیتے ہیں تاکہ وہ قہقہوں کی شکل میں چھلک پڑے۔

شعرائے قدیم اپنے معشوق کے نوک پلک گیسو رنگ و روغن کے سوا اس کے جوبن کے نکھار کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتے رہے ہیں کہ جس میں تیسری جہت بہت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مجتبیٰ حسین بھی اپنے کردار کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کے وجود کی جملہ جہتیں ابھر آتی ہیں اور ان کا مزاح العباد ثلاثہ بن کر چھا جاتا ہے۔ جو طول بلد اور عرض بلد سے بلکہ خط استوا سے بھی آگے نکل پڑتا ہے اور قاری بھی ان کے مزاح کے کینوس پر ابھر جاتے ہیں۔

"ریلوے منتری مسافر بن گئے" فی الحقیقت ان کا شاہ کار ہے۔ بزمِ نگار سمسار کے قہقہہ پروگرام میں بمبئی والوں نے ان کو اس پر دل کھول کر داد دی اور دھرم یگ نے اسے ہندی داں پبلک تک پہنچایا ہے۔ ویسے اب تو چاند کا سفر بڑا آسان لگنے لگا ہے مگر ریل کا بلا تحفظ سیٹ تھرڈ کلاس کا سفر جگ اور جیون سے ہاتھ دھو کر رام رام کرتے چلنے کے مصداق ہو گیا ہے ریل کے ڈبہ کی وسعت اور گنجائش کی کیا خوب وضاحت کی ہے ؎ سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

سفر کی صعوبتوں ڈبہ کے اندر قلابازیاں جسمانی آزار ان سب کا ان کے اس مضمون کے پڑھنے کے بعد نہ صرف صحیح احساس ہو جاتا ہے بلکہ ہنسی کے مارے جو پیٹ میں بل پڑتے ہیں اس کے بھی مجتبیٰ حسین ذمہ دار ہیں۔ عابد علی صاحب "مل مزدور" سے منتری تو بڑی آسانی سے بن گئے، کبھی وہ منتری سے "مل مزدور" بن کر بتائیں تو ہم جانیں، یا کوئی وزیر تعلیم استاد کا روپ دھار کر بتائیں، وزیر صحت مریض

بن کر دیکھیں وزیر خوراک کبھی وہ خوراک تو کھا کر دیکھیں جو عوام الناس کھلاتے ہیں۔ اس قسم کے مزید تجربے مجتبیٰ حسین کے قلم سے خوب مزہ دیں گے۔

"مرزا کی یادیں" مرزا کے کردار اور ان کے دفتر کے ماحول کو اس قدر واضح طور پر پیش کیا ہے کہ وہ ہمارے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں۔ اور ہم بھی اپنے آپ کو مرزا کا پرانا ساتھی سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کے وظیفہ حسن خدمت پر علیٰحدگی کا سانحہ ہم پر بھی شاق گزرتا ہے حالانکہ مرزا کی زندگی میں حسن اور خدمت دونوں کا فقدان رہا ہے۔ ان کا ہر کام تھرڈ ریٹ پر چلتا رہا ہے۔ اسی لئے مجتبیٰ حسین کے حسن توسط سے ہم تک بڑی خوبیوں کے ساتھ پہونچتا ہے۔ بالخصوص ان کا اپنی دفتری زندگی میں روزانہ حاضری کے رجسٹر پر دستخط کر کے تنخواہ حاصل کرنا ہم کو یاد دلاتا ہے کہ اب تمام عمر ان کو بالالتزام ہر سال ڈاکٹر کا صداقت نامہ پیش کرنا ہوگا کہ وہ بقید حیات ہیں۔ اور کبھی کسی وقت کسی وجہ سے حصول بقایا کے لئے انھیں پیروی کرنا ہوگا۔ تو صرف سال رواں کی حیاتی کا وثیقہ کام نہیں آئیگا انھیں یہ بھی بذریعہ صداقت نامہ ثابت کرنا ہوگا کہ سال گذشتہ بھی وہ زندہ تھے چاہے زندہ درگور رہے ہوں۔ مرزا نے ہمیشہ اپنے افسران بالادست کو خوش رکھا اس حد تک کہ اپنی رخصت کی درخواست میں یہ تک لکھدیا کہ: "خدا کے فضل وکرم اور آپکی مہربانی سے میرے گھر لڑکا تولد ہوا ہے۔ اس پر حاکم بڑے چراغ پا ہوئے کہ یہ میری مہربانی کا کیا ذکر ہے؟ ان کو اس کا بھی بڑا فخر حاصل رہا ہے کہ یہ اپنے حاکم اعلیٰ سے رخصت اتفاقی ہی حاصل کرتے رہے اور کبھی اس کا موقعہ نہیں آیا کہ یہ رخصت ناالتفاقی کے لئے درخواست کریں! یہ اور بات ہے کہ انھوں نے

رخصت مستحقہ (EARNED LEAVE) بھی نہیں لی کہ یہ کبھی اس کے مستحق ہی نہیں گردانے گئے۔

"اس دور میں ہوتے حاتم طائی" کے تحت انھوں نے فقیروں کی قسمیں بھی خوب گنائی ہیں۔ البتہ خاندانی فقیر کہ جن کا "سو پشت سے ہے پیشۂ آبا گداگری" آفاقی فقیر وردہ فقیر کہ جو بنا کر بھیس فقیروں کا تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں" اور صدا لگاتے ہیں "ہاں بھلا کر بھلا ہو گا - اور "درویش کی صدا کیا ہے" یہ ان کی فہرست سے خارج ہیں۔
ہمارے ایک دوست ہر قسم کے شغل میں مبتلا ہیں اور ان کی بیگم صاحبہ انھیں ہمیشہ ٹوکتی ہیں اور عبرت دلانے کی ناکام کوشش کیا کرتی ہیں، ایک بار ان کو ایک خستہ حال فقیر سے سابقہ پڑا، انھوں نے اس کو سگریٹ پیش کیا اس نے کہا کہ وہ سگریٹ نہیں پیتا، انھوں نے اس کو شراب کی پیش کش کی اس کو قبول کرنے سے بھی اس نے انکار کر دیا پھر اس کو لالچ دیا کہ ریس کورس چلے ہم جوا کھیلنے کے لئے کچھ روپیہ دیں گے اپنی قسمت بنا لینا، فقیر نے ناراض ہو کر کہا کہ وہ جوا بھی نہیں کھیلتا اس پر ہمارے دوست نے اس کو گھر چلنے کی دعوت دی تاکہ ان کی بیگم صاحبہ دیکھ تو لیں کہ جو شخص شراب سگریٹ نہیں پیتا، جوا نہیں کھیلتا اس کا کیا حشر ہوتا ہے۔ بالآخر فقیر ہی تو بن جاتا ہے۔
بے شک حاتم طائی اس دور میں ہوتے تو وہ خود ہی حاتم طائی کی قبر پہ لات ملتے اور فقیر بن جاتے۔

"سردی کی گرما گرمی تو فی الواقعی وہ ہے کہ جب شمع کا شعلہ بھی منجمد ہو جاتا ہے شعلے کو پھونک مار کر نہیں بجھایا جاتا بلکہ ٹھوس شعلے کو انگلیوں سے مسل کر توڑا جاتا ہے اور گفتگو

کرنے پر الفاظ پھٹا پھٹ منہ سے گرتے ہیں ان کو سننے کے لئے آگ پر تاپنا پڑتا ہے.
پیسہ کی گرمی گرمی کی گرمجوشی سردی کی سرد مہری ایسے موضوع ہیں کہ مجتبیٰ حسین ہی دلچسپ پیرایہ میں پیش کر سکتے ہیں یہ کسی اور کے بس کی بات نہیں امیر اور غریب کے فرق کو جانچنا کا پیمانہ ان کے دماغ کی اختراع ہے. کیا اچھا ہو کہ اس پیمانے سے انکم ٹیکس کو بھی جانچا جائے.
مہمان داری تو مجتبیٰ حسین نے خوب کی ہے کبھی یہ مہمان کی نظر سے میزبان کو جانچیں تو بڑے راز آشکار ہوں گے میزبان کس طرح مہمان کو پابند کرتا ہے اپنے اوقات پر اور صبح صبح اٹھا کر بٹھا دیتا ہے اس کے کھانے پینے کے ذوق کو یکلخت کیسے بدل ڈالتا ہے کیسے کیسے ستم ڈھاتا ہے گھر کے نوکروں کو کیسی بخشش، اور کتنا انعام و اکرام قہراً و جبراً دلاتا ہے.

ہوٹل شبانہ ایک تاریخی واقعہ ہے کاش کہ اس کے جملہ کردار بھی اصلی ناموں کے ساتھ پیش کئے گئے ہوتے ویسے تو مرزا کے کردار میں ہی بہت سارے جانے پہچانے شاعر اور ادیب نظر آتے ہیں زندہ بھی زندہ جاوید بھی۔ یہ حیدر آباد کی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہوتا اور اس کی ثقافتی زندگی کا آئینہ.

سلیمان اریب، ایم ایف حسین اور سعید بن محمد کے خاکے اس قصہ مختصر میں شریک ہیں. سلیمان اریب کو تو انھوں نے زندہ جاوید بنا دیا ہے اور جو مصور از خود زندہ جاوید ہیں ان کو ان کی زندگی میں ہی حیات جاوداں بخشش دی ہے.

مجتبیٰ حسین نے بہت ساروں کے خاکے اڑائے ہیں جو مضحک نہ ہوتے ہوئے بھی لطیف ہیں دل چسپ ہیں ان کے خاکوں میں غیر ضروری رنگ آرائی ہے نہ حاشیہ آرائی یہ ایسے حقائق کو پیش کرتے ہیں کہ جو پریوں کی کہانیوں سے زیادہ متحیر کن اور دلپذیر ہوتے ہیں، اور ہم ایک

احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان ہستیوں کو بہت قریب سے جانتے بوجھتے بھی ہمارے مشاہدہ میں وہ باتیں نہیں آئیں کہ جن کو مجتبیٰ حسین نے اپنی قلمی گرفت میں اسقدر آسانی سے جکڑ لیا ہے۔ سلیمان اریب کی مسکراہٹ کا ذکر جس انداز میں کیا ہے ملاحظہ طلب ہے: "یہ سنتے ہی اریب کے کمزور نحیف اور خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ بڑی دور تک پھیل گئی یہاں تک کہ جب مسکراہٹ ختم ہو گئی تو اریب کو اپنے ہونٹ پھر اپنی جگہ پر واپس لانے میں بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ پھیلی ہوئی مسکراہٹ اب پھر کبھی واپس نہ ہوگی جیسے یہ مسکراہٹ سمندر کی لہر بن کر ایک انجانے سفر پر روانہ ہو گئی ہو۔ اریب کی یہ مسکراہٹ میرے دل میں ایک خنجر کی طرح اتر گئی میں چپ چاپ اس خنجر کو اپنے دل میں چھپائے اور اریب کے ہونٹوں پر اپنی دی ہوئی مسکراہٹ کو جوں کا توں چھوڑ کر کمرہ سے باہر نکل آیا اور اس کے چند گھنٹوں بعد اریب اس دنیا سے چلے گئے۔" اریب کے درد کرب اور اس کی جان لیوا بیماری کا تذکرہ ایسے میٹھے لفظوں میں کیا ہے کہ جو ایک المیہ نغمہ کی طرح دل و دماغ پر چھا جاتا ہے یہ صرف مجتبیٰ حسین ہی چھیڑ سکتے ہیں اس طرح انھوں نے مشہور عالم مصور ایم ایف حسین کی آمد کا منظر جن سادہ الفاظ میں کھینچا ہے وہ دہرانے کے لائق ہے: "ریستوران کے دھندلے دھندلے سے کینوس پر حسین خود اپنے بنائے ہوئے کسی پورٹریٹ کی طرح نمودار ہوئے لمبی سی ڈاڑھی کے ہمراہ تیزی سے چلتے ہوئے ہماری طرف آئے اور پھر بڑی طاقت اور گرمجوشی سے یوں مصافحہ کیا جیسے وہ کینوس پر اپنے برش کا کوئی طاقتور اسٹروک لگا رہے ہوں اس کے بعد وہ صوفے پر یوں بیٹھ گئے جیسے وہاں کوئی مجسمہ رکھ دیا گیا ہو۔" اس عظیم فن کار کی زندگی کے جن پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے وہ نہ صرف لطافت و ظرافت کے میدان میں ایک بڑا کارنامہ ہے بلکہ سوانح نویسی کا ایک نیا ڈھنگ اختراع کیا ہے اور اس میدان میں دیگر معصروں سے بازی جیت لی ہے۔

بھارت چند کھنہ کی تیر نیم کش

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

بھارت چند کھنہ کی "تیر نیم کش" جگر کے پار تو نہ ہو سکی البتہ جگر پارہ بن کر رہ گئی ہے، طنز و مزاح کی خلش کو سینے میں رکھنے کا مزہ ہی اور ہے، بالخصوص جبکہ یہ مجموعہ اتنا دلچسپ ہو کہ اس کا ہر لفظ ظرافت و لطافت مضحکات و مطائبات سے پر ہو، نریندر لوتھر کو مصنف سے شکایت ہے کہ انھوں نے کوئی ایسا موضوع نہیں چھوڑا کہ جس پر کوئی اور قلم اٹھا سکے۔ مضمون نہ سہی موضوع کے چوری کے الزام سے بچنے کو وہ خود کوئی مضمون لکھنے سے پہلے عنوان کی حد تک کھنہ صاحب سے کلیرنس لے لیتے ہیں۔

شگوفہ کا بھارت چند کھنہ نمبر دیکھ کر تو ہمیں لگا کہ اوروں نے ان کی زندگی کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا حتیٰ کہ ان کی برائیاں بھی ایک صاحب نے گنا ڈالیں۔ ان کے مضامین اور موضوعات کے تعلق سے بھی بظاہر کوئی بحث تشنہ نہیں چھوڑی گئی۔ بعید باریک بینی سے کام لینے پر البتہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بھارت چند کھنہ مضمون نویس ہیں نہ انشایہ داز محض مزاح نگار بھی نہیں، یہ زیادہ تر آپ بیتی سناتے ہیں اور اس میں بھی "ہم، تم اور وہ" تینوں ہی موجود ہوتے ہیں۔ یہ اگر موٹر خریدتے ہیں تو ان کو گھیرنے والا

ایجنٹ اور دلال، ان کی بیوی بچے، نوکر اور گھر کے چھوٹے بڑے سب ہی حاضر ہیں کوئی عیب جوئی کے لئے تو کوئی ہمت توڑنے کے لئے اور کچھ تو موٹر کو دھکا دینے کے لئے محلے والے تماش بین راہ گذر سب ہی تو ہیں مگر بات یہیں پر نہیں ٹوٹتی، کھنہ صاحب کی موٹر جب چل پڑتی ہے تو لگتا ہے کہ ہم قارئین بھی ہوا خوری میں ساتھ ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ آگے جو بپتا پڑتی ہے اس کے بھی برابر کے شریک ہیں۔ بقول ان کے جب یہی موٹر ان پر سوار ہو جاتی ہے تو اس کا بوجھ ہم بھی اپنے سروں پر محسوس کرتے ہیں۔ یہ ہے ان کا حسن بیاں اور یہ ہے ان کا کمال کہ سب کو اپنے ساتھ گھسیٹ لیتے ہیں۔ میں نے اس صنف کا نام ہمہ جہتی مزاح رکھا ہے اور یہ ان کے جملہ مضامین میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔

بالعموم لوگوں کو دوسروں کو کیچڑ میں لت پت ہونے یا کیلے کے چھلکے پر سے پھسلتے دیکھ کر ہنسی آتی ہے اور اکثر مزاح نگار یہی کرتے ہیں کہ دوسروں کی خامیوں کوتاہیوں یا برائیوں کو ابھار کر کسی کو کانا، ناٹا، بونا، لنگڑا لولا یا احمق بنا کر ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ انتہائی گرا ہوا مذاق ہوتا ہے، برخلاف اس کے خود برداشتہ مزاح یا اس قسم کی ستم ظریفی کہ جس کا شکار خود ہو بہت کم لوگ پیدا کر سکتے ہیں۔ بھارت چند کھنہ کا مزاح کلیتہً خود برداشتہ اور دوسروں کے لئے بے ضرر ہوتا ہے۔ تیر نیم کش سے یہ خود اپنے آپ کو نشانہ بناتے ہیں دوسروں کو اس کی زد سے محفوظ رکھ کر خود بالکل نہیں ہنستے اوروں کو البتہ ہنساتے ہیں۔ کرکٹ کے اعلیٰ کھلاڑیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اب بھی یہ اس کھیل کے مانے ہوئے کا منیٹر ہیں۔ یہ اپنی بڑائی ہانک کر یا ڈینگیں مار کر شیخی بگھار کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش ہرگز نہیں کرتے بلکہ اپنے اس درخشاں دور کی دبی باتیں

سنلتے ہیں کہ جو ہماری ہنسی کو اکساتی ہیں.

کھنہ صاحب ہندوستان کی سب سے ممتاز و مفتخر سروس کے رکن ہیں. لیکن اپنی سروس کی بات ہی نہیں کرتے. ریاست کے سب سے بڑے عہدہ دار یعنی گورنر کے قرب کے باوجود ان کا مزاج اس ماحول سے متعلقہ تعلی کا آئینہ دار نہیں حالانکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ ہندوستان کے صدر جمہوریہ کے قریب رہ کر لوگوں نے ان عالی مرتبہ ہستیوں کے روزمرہ کو ضبط تحریر میں لاکر ان کی خوب کھلی اڑائی ہے اور شاید روپیہ بھی کمایا ہے مگر کھنہ صاحب کا گریز ایک دانشمندانہ فعل ہے.

"شخصیتیں جنھوں نے مجھے متاثر کیا" کے موضوع کے تحت اس ہستی کے ذکر سے عمداً اجتناب کیا ہے. جس کے متعلق دوسری جگہ "ذکر اس پری وش کا" عنوان کے تحت اپنی نصف بہتر کا جائزہ لیا ہے. مگر یہ بات بہر کیف ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہی ایک شخصیت ہے کہ جس سے یہ بیحد متاثر ہوئے ہیں. نیلی چھتری والے کے حضور میں دعا بھی مانگ لی ہے کہ ملکہ صاحبہ کی حکومت ان پر قائم و دائم رہے. ہم بھی اس دعا میں شریک ہیں اور آمین کہتے ہیں، اس لئے کہ ہر کامیاب اور نامور انسان کے پیچھے محض پشت پناہی کے لئے نہیں بلکہ اس کو اور آگے ڈھکیلنے کے لئے ایک عورت ذات کا ہونا ضروری ہے. اور اگر وہ بہتر سے بہتر ہو تو کیا کہنے. یہ اور بات ہے کہ بہت سارے کامیاب انسان اپنی نظر مد مقابل کی صنف نازک پر زیادہ رکھتے ہیں.

تبسم نیم کش کا دوسرا حصہ ڈراموں پر مشتمل ہے. ڈراموں کے اندر مزاح پیدا کرنے کی کوشش بھی ناسازگار ہوتی ہے لیکن کھنہ صاحب کی طرز نگارش کا اچھوتا پن

مزاح کی اپج ہر ڈرامہ میں چھائے ہوئے ہیں اور از ابتدا تا انتہا دلچسپی بندھی رہتی ہے۔ ہر ڈرامہ کا کردار ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ موضوع سخن اور ماحول میں ظرافت گھلی ملی رہتی ہے۔ ان کے کردار مسخرے ہیں نہ ہنسوڑ بلکہ یہ دماغی کسرت سے ہنسی بکھیرتے ہیں۔ کبھی کبھی ان ڈراموں میں ملک کے مسائل کو لطیف انداز میں پیش کر کے ان کے حل بھی بتلائے گئے ہیں۔ جو نادانستہ طور پر دل میں اتر جاتے ہیں۔ جیسے تین بچیاں "بڑھتی ہوئی آبادی کے بھیانک مسئلے کو دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ "ترپ کا پتا" حب الوطنی کے جذبات کو اکساتا ہے۔ اور قربانی کے لئے دیس کی پکار کا ڈھکا چھپا خاکہ دل پذیر انداز میں اتارا گیا ہے۔

میں اور میرا مزاح کے موضوع پر حیدر آباد کے بہت سارے مزاح نگاروں نے طبع آزمائی کی ہے لیکن بھارت چند کھنہ کی فطری منکسر المزاجی اور خاکساری ان کے آڑے آئی ہے۔ اور وہ اس عنوان کے تحت دل کھول کر لکھ نہ سکے۔ بلکہ گریز کرتے ہوئے اصل مضمون سے کچھ بھٹک ہی گئے۔ اور ہم کو تشنہ چھوڑ دیا ہے۔ یہ ایک طرح اچھا ہی ہوا کہ اسی تشنگی کو مٹانے کے لئے ہمیں ان کے ہر مضمون اور ڈرامہ کو بغور پڑھنا پڑا اور اس لذت مطالعہ کے لئے ہم ان کے مشکور ہیں۔ اور دعا کرتے ہیں کہ ان کے زور قلم کے باوجود ان کے "تیر نیم کش" ہی رہیں۔

[م جھ رل]